Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1961ء

قرآن کریم کی رو سے مسلمانوں کی خصوصیت

(۱) یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)
وہ دوسروں کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔

(۲) اور جب دوسروں کے فائدے کا کوئی کام کرتے ہیں تو ان سے کہدیتے ہیں کہ

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا (۷۶/۹)
ہم تم سے اس کا نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں۔ نہ شکریہ۔

لہٰذا

آپ ہر رات، سونے سے پہلے، یہ سوچئے کہ آپ نے آج، بغیر کسی ذاتی مفاد کے خیال کے، دوسرے انسان کے فائدے کا کیا کام کیا ہے؟ اگر آپ نے کوئی ایسا کام کیا ہے تو آپ نے اپنا فریضہ ادا کیا۔ اور اگر آپ نے اپنے فائدے کے لئے کسی کو نقصان پہنچایا ہے تو آپ کا ایک قدم جہنم کیطرف اٹھ گیا۔

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک
ہندو پاکستان سے سالانہ: آٹھ روپے
دیگر ممالک سے سالانہ: ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندو پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلی فون نمبر ۷۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-لاہور

جلد ۱۴	فروری ۱۹۶۱ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

لمعات		۲
روزہ کے احکام		۹
حقائق و عبر		۱۴
باب المراسلات	(ایک طاہرہ بہن کا خط)	۲۱
وحدتِ ملّت	(محترم پرویز صاحب)	۳۳
عربی حروف کیلئے نقطے	(محترم رحمت اللہ صاحب طارق)	۴۹
ہند میں اسلام کا آغاز	(ڈاکٹر محمد احمد صدیقی)	۶۵
نقد و نظر		۷۴
رابطہ باہمی		۷۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جن قوموں میں قوتِ عمل مفقود ہو جاتی ہے ان کی ساری عمر موہوم توقعات کے انتظار میں گذر جاتی ہے۔ ہمارے عالمگیر اجتماعی زوال کے زمانے میں ہم ہیں (دنیا کی دیگر زوال پذیر اقوام کی طرح) "آنے والے" کا عقیدہ[1] پیدا ہوا جس کے انتظار میں ہم صدیوں تک سہانے خواب دیکھتے رہے (اور اب بھی دیکھ رہے ہیں) زمانے کے تقاضوں نے اس عقیدہ کی کمزوری کو واشگاف کیا تو بجائے اس کے کہ ہم آمادہ بہ عمل ہو جاتے، ہم نے "انتظار" کی اور راہیں تلاش کر لیں۔ تحریک پاکستان کے دوران ہم اس انتظار میں رہے کہ جونہی پاکستان وجود میں آگیا ہماری تمام (انفرادی اور اجتماعی) خرابیاں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ پاکستان بن گیا اور ہماری خرابیاں: صرف بدستور رہیں بلکہ ان میں اور اضافہ ہوتا چلا گیا تو ہم نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ جب ہمارا آئین مرتب ہو جائے گا اس وقت یہ تمام خرابیاں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ نو دس سال کا عرصہ ہم نے آئین کے انتظار میں گذار دیا اور خرابیاں معاشرہ میں جڑ پکڑتی چلی گئیں۔ بالآخر جب آئین مرتب ہوا تو وہ ایسا ناقص تھا کہ اس سے اور خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کے بعد ہم پھر "دستے از غیب بروں آید و کارے بکند ــــ" کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ دو سال کے انتظار کے بعد، وہ "دستے از غیب" عسکری انقلاب کی شکل میں نمودار ہوا اور اس نے اس آئین اور نظام کی بساط لپیٹ کر رکھ دی۔ اس کے بعد ہم پھر ایک جدید آئین کے انتظار میں بیٹھ گئے، اور اب تک بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ مملکت کا آئین ہی وہ بنیاد ہوتی ہے جس پر اس کے نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس لئے صحیح معاشرہ کی تشکیل کے لئے صحیح آئین لاینفک ہوتا ہے۔ صحیح آئین سے صحیح قوانین مرتب ہوتے ہیں جو معاشرہ کی بہت سی خرابیوں کا سدباب کرتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ لینا کہ جب تک آئین و قوانین مرتب نہیں ہو جاتے ہمارے ذمے کوئی کرنے کا کام ہی نہیں۔ یا جونہی آئین و قوانین مرتب ہو گئے ہماری تمام خرابیاں خود بخود رفع ہو جائیں گی۔ غلط ہے۔ قانون

[1] اس سے شیعہ حضرات کے عقیدہ کی طرف اشارہ مقصود نہیں۔

افراد کی بے راہ روی پر پابندیاں عائد ہو سکتی ہیں، مگر ان کے اذہان کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ قلوب و اذہان کی اصلاح ہوتی ہے ذمہ داری کے احساس سے۔ آنے والی نسلوں کے دل میں ذمہ داری کا یہ احساس کس طرح پیدا کیا جا سکتا ہے، اس کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر بات کریں گے۔ جہاں تک موجودہ افراد کا تعلق ہے، انہیں اس احساس کو اپنے اندر خود بیدار کرنا ہوگا۔ اس کی صورت یہی ہے کہ وہ اس حقیقت کو ہر وقت سامنے رکھیں کہ

(۱) ان کا ہر عمل، حتیٰ کہ نگاہ کی خیانت اور دل میں گذرنے والا خیال تک، نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے اور اپنے اختیار و ارادہ کی حد تک انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اس سے کسی صورت میں مفر نہیں۔

(۲) غلط اعمال کی پاداش کے لئے اگر وہ موجودہ معاشرہ کی دستبرد سے بچ بھی جائیں گے تو بھی وہ خدا کے قانونِ مکافات کی زد سے کسی صورت میں نہیں بچ سکیں گے۔

(۳) زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں۔ اس کا سلسلہ موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اس لئے وہ قانونِ مکافات کی حد سے باہر نکل ہی نہیں سکتے۔ خدا اور آخرت پر ایمان کے یہی معنی ہیں۔

(۴) نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ بدمعاملگی۔ بدکرداری اور بددیانتی کا کفارہ کسی صورت میں نہیں بن سکتے۔ بلکر یوں کہیئے کہ اگر یہ "عبادات" انسان کو بدمعاملگی اور بددیانتی سے روکتی نہیں تو میزانِ خداوندی میں ان کا کوئی وزن نہیں۔ یہ "عبادات" مقصود بالذات نہیں بلکہ انسان میں حسنِ سیرت اور بلندیٔ کردار پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اگر ان سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ان سے منشائے خداوندی پورا نہیں ہو رہا۔ اور یہ محض بے روح رسوم بن کر رہ گئی ہیں۔

آپ غور کیجئے کہ موجودہ (غلط) معاشرہ میں بھی کتنے کام ہیں جنہیں ہم اپنے اختیار و ارادہ سے صحیح طور پر سرانجام دے سکتے ہیں، لیکن اس کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ کم از کم، ان امور کے متعلق ہم یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے کہ ہم ایک غلط معاشرہ میں ماخوذ تھے جس کا بدلنا ہمارے بس میں نہیں تھا۔ غلط معاشرے کی پیدا کردہ مجبوریاں بہت دور جا کر آتی ہیں اس حد سے ورے صبح سے شام تک بیسیوں معاملات ایسے آتے ہیں جن کا فیصلہ ہم نے اپنی مرضی سے کرنا ہوتا ہے۔ ان فیصلوں میں تو ہمیں کسی قسم کی مجبوری نہیں ہوتی۔ ذرا کسی شب، سونے سے پہلے، اپنے دن بھر کے کاروبار پر نگاہ ڈالئے اور سوچئے کہ ان میں کتنے معاملات ایسے تھے جن میں آپ کو کسی قسم کی مجبوری نہیں تھی اور ان میں سے کتنے تھے جن کا فیصلہ آپ نے دیانت اور امانت کے اصولوں کے مطابق کیا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ معاملات میں غیر محتاط رہنے سے، رفتہ رفتہ ہماری حالت یہ ہو چکی ہے کہ ہم میں اخلاقی اصول و ضوابط کا احساس ہی نہیں رہا اور اب ہم غیر شعوری طور پر غلط راستوں پر چلنے لگ گئے ہیں۔ پہلے یہ حالت تھی کہ اگر ہم کسی سے کہتے کہ تم نے جھوٹ بولا ہے تو وہ فوراً کہہ دیتا کہ "مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں جھوٹ بولتا؟" یعنی اُس وقت ہم ضرورت کے لئے جھوٹ بولتے تھے لیکن اب ہم جھوٹ (اور بددیانتی) کے کچھ ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ بلا ضرورت جھوٹ بولتے چلے جاتے ہیں اور نہ ہمارے اندر سے کوئی آواز ایسی اٹھتی

ہے جو ہمیں اس پر ملامت کرے اور نہ ہی (باہر) معاشرہ میں ہمیں کوئی ٹوکنے والا ہوتا ہے ۔۔۔ اس لئے کہ یہ خرابیاں معاشرہ میں کچھ اس طرح وباؤں کی طرح پھیل چکی ہیں کہ ان سے ساری فضا مسموم ہو گئی ہے۔ اور اب کسی کو خرابی، خرابی نظر ہی نہیں آتی۔ قرآن کریم نے بنی اسرائیل کی پست ترین اخلاقی حالت کا نقشہ یہ کہہ کر کھینچا ہے کہ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ (۵/۷۹)۔ "وہ ایک دوسرے کو کسی بُری بات سے جسے وہ کرتے تھے، روکتے نہ تھے"۔ ہماری حالت ان سے بھی بدتر ہو چکی ہے۔ ہم نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کو بُرائی سے روکتے نہیں، بلکہ جو شخص دیانتداری اختیار کرنا چاہتا ہے اس کی ہر طرح سے حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ ہر شخص اسے آ کر کہتا ہے کہ "میاں! اصول اور دیانت کو اس زمانے میں رہنے دو۔ تباہ اور برباد ہو جاؤ گے۔ اب کوئی کام اس طرح نہیں چل سکتا۔ ہم نے بھی اصول پسندی اختیار کی تھی۔ اتنے نقصان اٹھائے کہ اب تک سنبھل نہیں سکے۔ اب زمانہ ہی دوسرا آ چکا ہے اس لئے ۔۔۔ چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی ۔۔۔" یہ ہے وہ ماحول جو ہم نے یہاں پیدا کر رکھا ہے اور اس کے بدلنے کے لئے ہم قانون کا انتظار کر رہے ہیں۔ قانون اس سے زیادہ اور کیا کرتا ہے کہ وہ جائز اور ناجائز میں فرق کر کے بتا دے۔ نیا قانون زیادہ سے زیادہ یہی کرے گا کہ بعض ایسے امور کو، جو اس وقت ناجائز نہیں، ناجائز قرار دیدے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جو امور اس وقت قانون یا ضابطۂ اخلاق کی رُو سے ناجائز اور معیوب ہیں، ہم ان سے کب مجتنب اور محتاط رہتے ہیں۔ جو جدید قانون کی رُو سے ناجائز اور مذموم قرار دادہ امور سے احتراز برتیں گے؟ اُس وقت وہ کونسی تبدیلی ہمارے اندر پیدا ہو جائے گی جو ہمیں معیوب و مذموم اعمال کے ارتکاب سے روک دے گی؟ جس طرح ہم اب قانون سے گریز کی ہزار راہیں اختراع کر لیتے ہیں، اُس وقت بھی ہماری یہی کوشش ہو گی۔ یاد رکھئے! قانون کی پابندی، قانون کے احترام سے ہوتی ہے اور قانون کا احترام خارجی طور پر نہیں کرایا جا سکتا۔ یہ انسان کے قلبی احساس کا پیدا کردہ ہوتا ہے جب ہمارے قلوب میں اس وقت اس قسم کا احساس نہیں، تو چند دنوں بعد جب نیا آئین اور اس کی رو سے مرتب کردہ نئے قوانین نافذ ہو جائیں گے، اس وقت یہ احساس کیسے پیدا ہو جائے گا؟ لہٰذا یہ سمجھ کر نئے آئین کے انتظار میں بیٹھے رہنا کہ اس سے ہمارے معاشرہ کی تمام خرابیاں از خود دور ہو جائیں گی، خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ خرابیاں ہمارے اپنے دور کرنے سے دور ہوں گی۔ از خود دور نہیں ہوں گی اور ان کے دور کرنے کا طریقہ اس کے سوا کوئی اور نہیں کہ ہمیں اس امر کا احساس ہو کہ اپنے اپنے دائرۂ اختیار کے اندر اپنے فیصلہ اور عمل کے ذمہ دار ہم خود ہیں، اور ہمارا کوئی عمل بلانتیجہ نہیں رہ سکتا۔ ہم سے اس کا مؤاخذہ ہو گا۔ ہم مر کر بھی اس سے نہیں چھوٹ سکتے۔

علاوہ ازیں کتنی چیزیں ہیں جو قانون کے دائرے کے اندر آتی ہی نہیں۔ مثلاً قرآن کریم نے عدل اور احسان کا حکم دیا ہے۔ عدل کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ قانون کی رو سے حاصل کیا جا سکتا ہے (اگرچہ اس کا دائرہ بھی اتنا وسیع ہے کہ اس کی تمام شکلوں کو قانون بمشکل محیط ہو سکتا ہے) لیکن وہ کونسا ملکی قانون ہو گا جو آپ کو "احسان" کرنے پر مجبور کر سکے گا۔ یہ تو طیب خاطر ہی ہو سکے گا۔ اس کا جذبۂ محرکہ قانون شکنی کی سزا کا احساس نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے اس سے

کہیں زیادہ بلند احساس کی ضرورت ہے۔ وہ احساس اس یقین سے پیدا ہوتا ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں اس کے پاس اس سے بلند و برتر ایک شے اور بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما مقصدِ زندگی ہے، اور یہ مقصد ان بلند اقدار کے اتباع سے حاصل ہو سکتا ہے جنھیں قرآن شرفِ انسانیت کی بالیدگی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ احسان اسی قسم کے ایک مستقل قدر ہے۔ بلکہ ذرا گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو اسلامی قوانین کے اتباع سے بھی اصل مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی خلاف ورزی سے بھی اسی لئے احتراز برتا جاتا ہے کہ اس سے انسانی ذات میں ضعف و انتشار واقع ہو جاتا ہے۔ بات پھر وہیں آ گئی کہ قانون کے دائرے سے باہر کی اقدار کی تکریم تو ایک طرف، ایک مسلمان کے دل میں قانون کے احترام اور اتباع کا جذبہ بھی اس یقین سے بیدار ہوتا ہے کہ اس کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے، خواہ اسے کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو اور اس کی موت بھی ان اثرات کو نہیں مٹا سکتی۔ جس شخص کو اس حقیقت کا یقین نہیں اور اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے، وہ فریبِ نفس میں مبتلا ہے جو جس قدر جلد اس فریب سے نکل جائے اچھا ہے۔

یہاں تک گفتگو موجودہ نسل کے متعلق تھی جو جوان ہو کر کاروبارِ زندگی میں عملاً شریک ہو چکی ہے۔ باقی رہیں ہماری آنے والی نسلیں، سو ان کے متعلق ہم روزِ اول سے اس حقیقت پر زور دیتے چلے آ رہے ہیں کہ جب تک ہمارا نظامِ تعلیم نہیں بدلا جائے گا ان میں اصلاح کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ مقامِ مسرت ہے کہ نظامِ تعلیم میں تبدیلی کی اہمیت ہماری موجودہ حکومت کے پیشِ نظر بھی ہے اور اس کے لئے اس نے عملی قدم بھی اٹھایا ہے۔ یعنی تعلیمی کمیشن کا تقرر اور اس کی سفارشات پر عمل درآمد کے لئے جدوجہد۔ لیکن جیسا کہ ہم اس کمیشن کے تقرر کے وقت اور اس کی سفارشات کے سلسلہ میں پہلے بھی لکھ چکے ہیں، جس مقصد کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، وہ ان سفارشات سے حاصل نہیں ہو سکے گا۔ ان سے موجودہ نظامِ تعلیم کی بالائی عمارت میں کچھ ردوبدل یا مرمت تو ہو سکے گی لیکن ان سے اس عمارت کی بنیادوں کی کمزوری رفع نہیں ہو سکتی۔ اور اصل سوال بنیادوں کی اصلاح ہے۔ ہو سکتا ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم سے ہم اچھے انجینئر۔ اچھے ڈاکٹر۔ اچھے سائنسدان۔ اچھے ایڈمنسٹریٹر۔ اچھے قانون داں پیدا کر سکیں۔ لیکن اس سے ہم اچھے انسان پیدا نہیں کر سکیں گے ـــــ اور یہ واضح ہے کہ اچھے انسان اور مسلمان مرادف المعنی ہیں۔ اچھے انسان بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے طالب علموں کے ذہن میں اس حقیقت کو جاگزیں کریں کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ آج جو طالب علم۔ اعلیٰ سے اعلیٰ امتحان میں فرسٹ آئے، اس سے بھی پوچھئے کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ تو وہ منہ دیکھتا رہ جائے گا۔ ہمارے نوجوانوں کی آوارگیٔ فکر و نظر اور فقدانِ سیرت و کردار (کہ جس کا رونا ہم ہر روز روتے رہتے ہیں) کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے ذہن میں نہ انسانی زندگی کا کوئی متعین مقصود ہے نہ سفرِ حیات کی مقررہ منزل۔ زندگی ان کے نزدیک صرف طبیعی زندگی (Physical Life) ہوا اور

مقصودِ حیات اس زندگی کی آسائش و آرائش اور جسم کی لذات و حظائظ جسے یہ حاصل ہوں (خواہ کسی طریق سے ہوں) اس کی زندگی کامیاب۔ جو اس دوڑ میں پیچھے رہ جائے وہ ناکام و نامراد۔ اس تصورِ حیات کے ماتحت ان میں کیریکٹر کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک ہم اپنے نظامِ تعلیم کو بالکل نئی بنیادوں پر استوار نہیں کرتے۔ اس میں ہم جس قدر تاخیر کرتے جائیں گے اتنی ہی غلط قسم کی نسلوں کا اضافہ ہوتا جائے گا۔ یہ وہ بنیادی خرابی ہے جس کے ازالہ کے لئے ہمیں جدید آئین اور اس کے تابع مرتب ہونے والے قوانین کے انتظار کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہم پہلے ہی تیرہ چودہ برس کا نہایت قیمتی عرصہ ضائع کر چکے ہیں۔ اس میں ایک ایک دن کی مزید تاخیر ہمیں برسوں پیچھے دھکیل دے گی۔

نئی نسلوں کی تعلیم کا خیال کرتے ہی ان کی صحت کا سوال سامنے آجاتا ہے۔ قرآن کریم، علم اور جسم، دونوں کی وسعت اور کشادہ اور قوت اور صلاحیت، کو زندگی کے استحکام کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ انسانی قلب و دماغ کا سفر جسم کی گاڑی پر طے ہوتا ہے۔ جب یہ گاڑی کمزور اور بوسیدہ اور شکستہ ہوگی تو مسافر منزلِ مقصود تک کیسے پہنچ سکے گا۔ ہماری آنے والی نسلیں کس قسم کی صحت لے کر اُٹھ رہی ہیں، اس کے لئے کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک ایسی محسوس حقیقت ہے جس کا مشاہدہ ہر گھر، ہر محلہ، ہر مکتب، اور ہر مدرسہ میں، ایک نظر میں کیا جا سکتا ہے۔ جب ان بچوں پر نگاہ جاتی ہے تو انسان محوِ حیرت اور غرقِ تاسف ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے نحیف و نزار جسم، زندگی کی گاڑی کو کہاں تک کھینچ سکیں گے۔ تعلیم کی طرح بچوں کی صحت کا مسئلہ بھی انفرادی نہیں، اجتماعی ہے۔ صحت، مختلف اجزاء سے مل کر بنتی ہے۔ اور ان تمام اجزاء کا یکجا کرنا، کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے معاشرہ کے اجتماعی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس باب میں بھی ہماری حکومت کی طرف سے جو کچھ کیا گیا ہے (اور کیا جا رہا ہے) اس کا ہمیں اعتراف ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ وسیع اور شدید کوششوں کا متقاضی ہے۔ نشوونما دینے والی خالص غذا، صاف ستھری فضا اور مرض کی ابتدائی اسٹیج سے آخری اسٹیج تک سب کے لئے یکساں اور بلا قیمت علاج، قوم کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ اس کے لئے اگر ہمیں اپنی علی عمارات کی تزئین و آرائش کے ہزار پروگرام بھی ملتوی کرنے پڑیں تو انہیں بلا دریغ ملتوی کر دینا چاہیئے۔ جب مکین ہی نہیں رہے گا تو مکان کس کام آئیگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے عظیم پروگرام کی تکمیل کے لئے کافی وقت درکار ہوتا ہے لیکن اسے قومی منصوبے کے طور پر سامنے رکھ کر اس کی ابتدا کر دینی چاہیئے اور اس کے بعد اس کی ترقی کا جائزہ لیتے رہنا چاہیئے۔

صحت کے ساتھ ہی روٹی کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔ بلکہ غور سے دیکھئے تو اس سلسلہ میں سرفہرست اس کا شمار ہونا چاہیئے۔ اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل تو صرف قرآنی نظامِ ربوبیت سے ہو سکتا ہے جس میں تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا مملکت کی ذمہ داری ہوتا ہے اور اس اہم فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے وسائلِ پیداوار مملکت کی تحویل میں رہتے ہیں۔ اس نظام کی کامیابی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ عمالِ مملکت اس کیریکٹر کے حامل ہوں جس کی طرف اوپر

اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس قسم کا کردار صحیح تعلیم سے پیدا ہو سکتا ہے۔ بہ حالاتِ موجودہ حکومت نے زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں جو قدم اٹھایا تھا وہ اسی سلسلہ کی پہلی کڑی تھا۔ اور نہایت مبارک و مسعود۔ ہمارے خیال میں، وقت آگیا ہے کہ اب اس سلسلہ میں دوسرا قدم بھی اُٹھایا جائے۔ ملک میں بے شمار زمین ابھی غیر آباد پڑی ہے اور اس کی آبادی کے لئے بہت سی تجاویز حکومت کے زیر غور ہیں۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ ان زمینوں کو چھوٹے چھوٹے قطعات میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک قطعہ، خود کاشت کے طریق پر ایک متوسط گھرانے کی ضروریات کا کفیل ہو سکے۔ ان قطعات کو اس شرط پر (بلا قیمت) الاٹ کر دیا جائے کہ جو اسے (ایک معینہ مدت کے اندر) آباد کر لیگا وہ اسی کی ملکیت ہو جائے گا۔ (ملکیت سے مراد یہ ہے کہ اس کی پوری پوری پیداوار کا وہ مالک ہوگا)۔ اس آبادکاری میں حکومت ان کاشتکاروں کی پوری پوری امداد کرے۔ اس طرح، ایک طرف لاکھوں افراد کی روزی کا انتظام ہو جائے گا، اور غیر آباد زمینیں آباد ہو جائیں گی اور بہیئت مجموعی ملک کی خوراک کا مسئلہ بھی بڑی حد تک حل ہو جائے گا۔ یہ انتظام قرآنی نظام ربوبیت کی طرف ایک اور قدم بڑھائے گا۔ ہماری تاریخ کے قرنِ اوّل میں ایسا کیا گیا تھا۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ان الارض، ارض اللہ، والعباد عباد اللہ۔ من احیا ارضا میتۃ فھی لہ۔ "زمین اللہ کی زمین ہے اور بندے اللہ کے بندے ہیں۔ جو شخص بنجر زمین کو آباد کرے گا وہ اسی کی ہوگی"۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

> حقیقت یہ ہے کہ پوری زمین بمنزلہ مسجد اور سرائے کے ہے جو مسافروں کے لئے وقف ہوتی ہے اور سب لوگ اس میں برابر کے شریک ہوتے ہیں اسی لئے ہر پہلے آنے والے کو پیچھے آنے والوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ زمین پر آدمی کے حق ملکیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس سے نفع اٹھانے کا حق، قابض کو بہ نسبت دوسروں کے زیادہ حاصل ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

اس کے یہ معنی نہیں کہ جس کا جی چاہے بنجر یا افتادہ زمینوں پر قابض ہو جائے۔ ان زمینوں کی تقسیم حکومت کی طرف سے ایک نظم کے مطابق ہوگی۔ اس انتظام کے لئے بھی ہمیں جدید آئین کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ اسے ملکہ مجوزہ آئین کے اندر شامل کر دینا چاہیئے۔

اسے ہم پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ ان تمام اقدامات کی کامیابی کی اولین شرط یہ ہے کہ کم از کم اعمال حکومت صحیح سیرت و کردار کے حامل ہوں۔ اس سلسلہ میں ایک (فوری) تجویز ہمارے سامنے ہے، جسے ہم حکومت کے غور و فکر کے لئے پیش کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ حکومت نے حال ہی میں ایک اسٹاف کالج قائم کیا ہے جس میں اعلیٰ افسران کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے گا۔ سول سروس اکادمی کی طرح اس میں بھی "اسلامیات" کا شعبہ ضرور ہوگا۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ اس شعبہ میں، اسلامیات کی رسمی تعلیم دینے کے بجائے، ایسی تعلیم دی جائے

جس سے متعلمین کے سامنے انسانی زندگی کا مقصد۔ حیوانی اور انسانی زندگی کا فرق۔ انسانی ذات کا صحیح صحیح تصور۔ اس کی نشوونما کے اصول وضوابط۔ قانونِ مکافاتِ عمل۔ تسلسلِ حیات۔ قرآن کی پیش کردہ مستقل اقدار اور ان کی بنیادوں پر استوار اسلامی نظام کا نقشہ نہایت واضح انداز میں آجائے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ان موضوعات کو، عصرِ حاضر کی علمی اور سائنٹی سطح پر لاکر اجاگر کیا جائے اور انھیں دلائل و براہین کی رُو سے (Rationally) ذہن نشین کرایا جائے تو اس سے ان نوجوانوں کے دل میں وہ یقین پیدا ہو جائے گا جو صحیح کیریکٹر کی بنیاد ہے۔ اِدھر یہ کیا جائے اور اُدھر ہماری درسگاہوں کا نظامِ تعلیم بدل دیا جائے جس سے ہر فارغ التحصیل طالب علم اسی ایقان اور ایمان کا پیکر بن کر نکلے۔ پھر دیکھئے کہ یہ زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے کس طرح جگمگا اٹھتی ہے۔

پرویز صاحب ریڈیو پر

محترم پرویز صاحب، ۱۹ر فروری ۱۹۶۱ء کو شام کے چھ بج کر پینتالیس منٹ (۶-۴۵) پر، لاہور ریڈیو اسٹیشن سے روزے کے مقصد پر تقریر کریں گے۔

طلوعِ اسلام کے آئندہ پرچہ میں

اسلام میں قانون سازی کے اصول سے متعلق

ایک مبسوط اور اہم مقالہ

شائع ہو رہا ہے۔

قارئین نوٹ فرمالیں۔

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آرہا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معمول کے مطابق[1] قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورۂ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں۔

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

(۱) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تم قانونِ خداوندی کی گہداشت کر سکو۔

(۲) أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ۔

(۲) یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

(۳) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

(۴) وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ

(۴) اور جو لوگ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں ان کے لئے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

(۵) فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

(۵) اس کے بعد بھی اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کرے تو مزید اجر کا موجب ہوگا۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ .....

(۶) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

---

[1] ان احکام کو ہم اس سے پہلے بھی کئی بار درج کر چکے ہیں لیکن ہم ان کے اعادہ کی ضرورت ہر سال سمجھتے ہیں۔ اس لئے انہیں پھر دہرایا جا رہا ہے۔

(۷) فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (۲/۱۸۳-۱۸۵)

(۷) لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرے۔

(۸) وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ (۲/۱۸۷)

(۸) اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۹) أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلٰى نِسَائِكُمْ (۲/۱۸۷)

(۹) اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ

(۱) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں بلکہ پورے مہینے کے)

(۲) روزے میں، اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے، دن کے ختم ہونے تک، کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

(۳) روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرے۔

(۴) اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے اور نہ مسافر ہے لیکن کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے، اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرے۔ ایسے لوگوں کا حکم آیت نمبر ۲ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمائیے اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ کا ترجمہ ——— وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں ——— کیا ہے۔ حالانکہ اس کا عام ترجمہ ——— اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ——— کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس ترجمہ کی رو سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا منشا یہ نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ ہمارے مترجمین نے

عربی کے لفظ " طاقت " کا ترجمہ اردو کے لفظ طاقت سے کر دیا - اور دونوں زبانوں کے مفہوم میں جو فرق تھا - اسے نظر انداز کر گئے عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے - محیط المحیط جلد دوم صفحہ ۱۳۰۴ میں ہے -

طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں - لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں کہ جسے انسان بمشقت کر سکتا ہے - دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے - "لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ" کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجا لانا ہمیں دشوار ہو -

اسی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب صفحہ ۳۰۱ جلد ۱۲ میں ہے کہ

طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو -

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵ جلد ۲ میں فرماتے ہیں کہ

اِطَاقَةٌ دراصل مُکْنَتٌ اور قُدْرَتٌ کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے - چنانچہ عرب اَطَاقَ الشَّیْءَ صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو - یعنی بدشواری اسے برداشت کر سکتا ہو - چنانچہ یُطِیْقُوْنَهٗ سے مراد بوڑھے ، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہیں یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے ...... اسی بنا پر امام راغب نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بہ مشقت ممکن ہو -

اسی کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ

طَاقَةٌ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنھیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جا سکے اور وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے - (تفسیر کشاف صفحہ ۲۵۵ جلد ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ

عربی زبان میں اَلْوُسْعَ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طَاقَةٌ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو - لہٰذا (آیۂ زیر نظر) کے معنی یہ ہوں گے اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں - ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے .... (روح المعانی صفحہ ۵۹ جلد ۲)

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ " طَاقَةٌ " کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا ترجمہ ـــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ـــ کر دینا کس قدر غلط فہمیوں کا موجب ہو سکتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ ـــ اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ـــ کیا ہے -

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کرے۔ چنانچہ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ میں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" (صفحہ ۲۸۸ - ۲۸۹ جلد ۲) میں ہے کہ

> تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں۔ ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ مستحب ہے۔ اور حضرت انسؓ۔ ابن عباسؓ قیس بن السائبؓ اور ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنفیہ) امام احمدؒ اور امام اسحاقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ نیز ابن عباسؓ کی روایت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ام ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا بچہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو بہ مشقت روزے رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تیرے ذمہ فدیہ ہے۔ قضا نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

> اَلَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے یہاں مراد بوڑھے ضعیف، اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں۔ جن کی معاش خدا نے پُر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو...... تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو روزہ رکھنا گراں گذرتا ہو جیسے بڑھاپا۔ اور پیدائشی کمزوری۔ اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت۔ اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔
>
> (تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵-۱۵۷ جلد ۲)

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔

۱۔ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔

۲۔ حاملہ عورتیں۔

۳۔ دودھ پلانے والی عورتیں۔

۴۔ اپاہج اور معذور لوگ۔

۵۔ پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ رہے اور وہ ان کی وجہ سے روزہ بمشقت رکھ سکیں۔

۶۔ ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (constitutionally) کمزور پیدا ہوئے ہوں۔

۷۔ وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پُر مشقت کاموں میں ہوتی ہے۔ مثلاً کانوں میں کام کرنے والے اور کارخانوں میں کام کرنے والے یا رکشہ چلانے والے۔

۸۔ وہ مجرم جن سے جیل میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالاتِ موجودہ، اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اصول یہی ہے کہ جو شخص بمشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآن کریم میں دیکھ لیں۔ (یعنی سورۂ بقرہ۔ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۵)

سرمایہ داری اور اشتراکیت کے موجودہ ٹکراؤ میں خدا کا عطا فرمودہ دین انسانی معاشرہ میں جنت ارضی کی کیسی بساط بچھانا چاہتا ہے اور جسمانی تقاضوں کو کس حسین انداز سے پورا کر کے انسانی ذات کی حیاتِ جاوید کی اور آخری منزلِ مقصود کی راہیں ہموار کرتا ہے ——— اسے جاننے کے لئے

نظام ربوبیت

سے بہتر کوئی کتاب ابھی تک انسانی قلم سے شائع نہیں ہوئی!

پرویز صاحب کا مخصوص اندازِ فکر۔

رعایتی قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ:- میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷۔ بی ۔ شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور

حقائق و عبر

صالحین کی باتیں

ماہنامہ ترجمان القرآن میں، محترم مودودی صاحب کے "ارض القرآن کے سفر" کی روئداد مسلسل شائع ہو رہی ہے۔ دسمبر ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں اس میں "ایک دلچسپ انکشاف" کی ذیلی سرخی کے ساتھ حسب ذیل واقعہ درج ہوا۔

مغرب کے بعد ہوٹل واپس پہنچے تو وہاں ملاقات کے لئے آئے ہوئے حضرات کا ایک ہجوم موجود تھا جس نے رات گئے تک ہمیں یہ موقع ہی نہیں دیا۔ کہ ہم کسی اور جگہ جا سکتے۔ آنے والے حضرات میں ایک صاحب (جو در اصل ہندوستانی تھے لیکن اب آٹھ دس سال سے سعودی مملکت ہی میں رہ رہے ہیں) مکہ معظمہ کے روزنامہ "المندوہ" کے نمائندہ بھی تھے۔ بہت عمدہ اردو بول رہے تھے۔ انھوں نے مولانا سے اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیتے ہوئے مقصد سفر کے متعلق چند سوالات کئے ان سوالات میں ان کا ایک سوال "حدیث اور فقہ کے متعلق مولانا کی رائے" کے بارے میں بھی تھا۔ اس سوال کی جو وجہ انھوں نے بتائی وہ بڑی ہی تکلیف دہ تھی۔ شاید قارئین کو اس کے سننے پر یقین نہ آئے جیسا کہ اس کے پہلی بار سننے پر ہمیں بھی یقین نہ آیا تھا، لیکن جب نمائندہ المندوہ نے بار بار یقین دلایا تو کم از کم ہم ان کے اس بیان کو غلط قرار نہ دے سکے۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۵۸ء کے حج سے پیشتر مصر کے ایک پرچہ میں یہ شائع ہوا کہ مولانا مودودی حدیث اور فقہ کے منکر ہیں۔ اس کے بعد جب اسی سال لائل پور اور لاہور کے دو عالم۔ جن کا پہلے جماعت اسلامی سے تعلق تھا۔ حج کے لئے تشریف لائے، اور ان سے اس کے متعلق سوال کیا گیا، تو ان دونوں نے اس کی تائید کی۔ کلیۃ الشریعہ کے جو طلبہ وہاں بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے لائل پور ہی کے ایک اور صاحب کے متعلق (جو پہلے ریاض کے کلیۃ الشریعہ میں طالب علم تھے اور ہماری ریاض میں موجودگی سے پیشتر پاکستان واپس آ گئے تھے) بتایا کہ انھوں نے مولانا مودودی کو بدنام کرنے کے لئے ریاض میں باقاعدہ مہم شروع کر رکھی تھی اور علماء کو مولانا کے خلاف بھڑکانے کے لئے انھوں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ ۱۹۵۶ء میں

حج کو واپسی پر مولانا نے اپنے سفرنامہ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی قبروں کے قبے گرانے پر سعودی حکومت کی مذمت کی ہے اور اسے سخت بُرا بھلا کہا ہے۔ ع

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

اس پر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے ماہنامہ "میثاق" کی جنوری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں "مراسلہ و مذاکرہ" کے عنوان سے، حسب ذیل، سوال اور جواب، شائع ہوئے ہیں۔

خانہ ساز جھوٹ

سوال:۔ دسمبر کا رسالہ ..... آپ کی نظر سے گذرا ہوگا۔ اس میں ..... صاحب نے ارض القرآن کے سفر کے سلسلہ میں یہ انکشاف فرمایا ہے کہ آپ نے اور حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب نے سفر حج کے دوران میں مکہ معظمہ کے کسی اخبار کے کسی نمایندہ کے سامنے مولانا ...... سے متعلق اس الزام کی تائید کی کہ وہ حدیث اور فقہ کے منکر ہیں۔ اگرچہ مضمون میں آپ لوگوں کا نام نہیں لیا گیا ہے لیکن لکھا اس طرح گیا ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن بے تکلف آپ ہی لوگوں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ میں نے تو اس کو ایک بالکل بے بنیاد بات سمجھا اس لئے کہ میں آپ کے مزاج سے واقف ہوں۔ لیکن دوسرے بہت سے لوگوں کو اس سے آپ کے بارے میں سخت غلط فہمی ہو سکتی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ آپ میثاق میں اس کی وضاحت فرما دیں۔

جواب:۔ مذکورہ مضمون میری نظر سے گذرا تھا لیکن میں نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس ٹکسال میں یہ جھوٹ گھڑا گیا ہے اس میں میری نسبت آئے دن اس طرح کے جھوٹ گھڑے جاتے ہیں اور ان کو گھڑنے اور پھیلانے کے لئے تنخواہ پانے والے ملازموں کی ایک پوری ٹیم موجود ہے۔ میں تنہا ان لوگوں کا ایک ایسے فن میں کس طرح مقابلہ کر سکتا ہوں جس کی انھوں نے برسوں تربیت حاصل کی ہے۔

اس اتہام کا تعلق جہاں تک حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب سے ہے وہ اپنے متعلق بہتر طریقہ پر خود ہی کچھ کہہ سکتے ہیں۔ البتہ میں اپنی نسبت یہ عرض کرتا ہوں کہ میرے پورے سفر کے دوران میں میری ملاقات کسی اخبار کے ایڈیٹر یا نمایندہ سے نہیں ہوئی۔ صرف جدہ ریڈیو کا ایک نمایندہ مجھ سے ملا تھا لیکن اس نے بھی مجھ سے اس قسم کا کوئی نامعقول سوال نہیں کیا جس قسم کے سوال کا مضمون میں حوالہ دیا گیا ہے اس کے سوالات یا تو سعودی حکومت کے متعلق میرے تاثرات سے متعلق تھے۔ یا جماعت اسلامی سے میری علیحدگی سے متعلق۔ اور اس بیچارے کو بھی میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ صرف یہ کہہ کر ٹال دیا کہ سفر کی اس رواروی میں میرے لئے ان سوالوں کا جواب دینا ممکن نہیں ہے۔ بعد میں ان کے جواب نوٹ کر کے میں بھیج دوں گا۔ افسوس ہے کہ یہ وعدہ بھی میں نے پورا نہیں کیا۔

اس سفر کے دوران میں میری جن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور جس قسم کے سوالات مجھ سے کئے گئے میں نے ان سب کا ذکر اپنے سفرنامہ میں کر دیا ہے۔ اگر کسی اخبار کے نمایندے نے مجھ سے ملاقات کی ہوتی تو میں اس کا ذکر بھی ضرور کرتا۔ میں نہ تو باتوں کا چھپانے کا عادی ہوں اور نہ لیڈر لوگوں کی طرح ایچ پیچ کی باتیں کرنے کے فن سے واقف ہوں۔ مجھے کسی کے متعلق کوئی بات کہنی ہوتی ہے تو علی رؤس الاشہاد ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں۔ مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے کہ میں کسی شخص پر اس کے پیچھے سے بزدلانہ حملہ کروں اور میں اتنا غبی بھی نہیں ہوں کہ کسی شخص پر ایسی تہمت لگاؤں جو ہر سننے والے کو بالکل احمقانہ معلوم ہو۔

بعض لوگوں کو اپنی مظلومیت کے ڈھونگ رچانے کے بڑے ڈھنگ آتے ہیں۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ محض مجھے بدنام کرنے کے لئے یہ جھوٹ یہیں گھڑا گیا ہے تاکہ سادہ لوح سننے والے اس کو سن کر کہیں کہ دیکھو فلاں بیچارہ کس قدر مظلوم ہے کہ لوگ حج کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی اس کے متعلق بے بنیاد قسم کی باتیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ ورنہ آخر اس بات کا کیا تک ہے کہ فلاں شخص حدیث اور فقہ کا منکر ہے۔ میں اگر کہنا ہی چاہتا تو کیا کہنے کے لئے سچی باتیں کم تھیں۔؟

دوسرے ملکوں کے اخبارات کے متعلق یہ بات بھی واضح رہنی چاہیئے کہ وہ اپنے ملک سے باہر کے افراد واشخاص کو اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ ان کو ان کے حدیث و فقہ سے متعلق نظریات سے کوئی دلچسپی ہو۔ مجھے اس سفر میں جماعت اسلامی سے دلچسپی رکھنے والے صرف وہی لوگ معلوم ہوئے جو اخوان سے کسی نہ کسی نوع سے وابستہ تھے۔ انھوں نے مجھ سے جو سوال مشترک طور پر کیا وہ صرف یہی تھا کہ میں جماعت سے کیوں الگ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ میں نہایت ہی احمق آدمی ہوتا اگر ان کو اس سوال کا یہ جواب دیتا کہ اس لئے کہ فلاں صاحب حدیث اور فقہ کے منکر ہیں۔

جن لوگوں نے یہ جھوٹ گھڑا اور اس کو پھیلایا ہے وہ بیچارے محض پیٹ کی خاطر یہ دھندا اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ دوسرے کی دنیا بنانے کے لئے تو اپنی عاقبت خراب کریں۔ ایسے بدقسمت لوگوں کے بارے میں میں اس کے سوا کیا کہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے حال پر رحم فرمائے۔

ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ ان میں سے کون صاحب سچے اور کون جھوٹے ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مودودی صاحب بڑے فخر سے اعلان کیا کرتے ہیں کہ انھوں نے پوری کی پوری قوم سے ان صالحین کو چن چن کر اپنی جماعت میں شامل کیا ہے، جو سیرت و کردار میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی جماعت میں، مولانا اصلاحی صاحب، مودودی صاحب کے دست راست تھے۔ اگر مذکورہ صدر واقعہ میں مودودی صاحب سچے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کے اس قسم کے منتخب رفقاء کے سیرت و کردار کی بلندی صرف اس وقت تک ہوتی ہے جب تک وہ مودودی صاحب کے ساتھ رہیں، اور جونہی

وہ ان سے الگ ہو جائیں۔ وہ سیرت و کردار کی اس پست ترین سطح پر جا پہنچے ہیں؟

دوسری طرف اگر اس واقعہ میں اصلاحی صاحب سچے ہیں تو ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ آپ اٹھارہ سال تک اس گروہ میں شامل رہے۔ کیا آپ پر یہ حقیقت آج کھلی ہے (جب ان کی زد خود آپ پر پڑی ہے) کہ اس جماعت میں "جھوٹ گھڑنے اور پھیلانے کے لئے تنخواہ پانے والے ملازموں کی ایک پوری ٹیم موجود ہے" اور یہ "بیچارے یہ دھندا محض پیٹ کی خاطر اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں"۔ اور کیا یہ پیٹ کی خاطر اب دھندا اختیار کرنے والے وہی (مودودی صاحب) ہیں جن کے متعلق آپ نے بھری کچہری میں فرمایا تھا کہ آپ انہیں "مزاج شناس رسول" سمجھتے ہیں؟

نقاب اٹھنے کے بعد کیسی کیسی حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔!

دوسری طرف

مودودی صاحب کے گروہ کے ترجمان، ہفتہ وار ایشیا کی ۵ رجنوری ۱۹۶۱ء میں حسب ذیل مراسلت شائع ہوئی ہے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آج تازہ ایشیا ملا۔ جس کے دوسرے صفحہ پر "کار نبوت اور طریق نبوت" مضمون کو پڑھا۔ اس مضمون کے اوپر لکھنے والے کا نام تحریر فرمایا ہے۔ "مولانا امین احسن اصلاحی" پڑھتے ہوئے میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ کیسے مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ماہ نومبر اور ماہ دسمبر کے میثاق میں انہوں نے اسی عنوان کے تحت "انبیاء کا طریق کار" تحریر فرمایا ہے (میرا خیال تھا۔ کہ آپ نے وہ نقل فرمایا ہے) لیکن جس قسم کی وضاحت میثاق میں انہوں نے کی ہے وہ اس مضمون سے بالکل مختلف ہے۔ جس کو ایشیا میں آپ نے شائع فرمایا۔ ایشیا کا پورا مضمون بالعموم اور ذیلی عنوان۔ طریق نبوت۔ والا حصہ بالخصوص تو مولانا امین احسن اصلاحی کے نظریات کے بالکل مخالف ہے۔

انہوں نے "میثاق" میں جتنا کچھ لکھا ہے سارا زور اسی بات کو ثابت کرنے کے لئے صرف کیا ہے۔ کہ "یہ طریق نبوت نہیں اس کو اہل سیاست نے اپنے اقتدار کے حصول کے لئے طریق نبوت کا نام دیا ہے۔ چند ایک اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں۔ (وہ انبیاء) اس بات کی دعوت کبھی نہیں دیتے۔ کہ آؤ حکومت الٰہیہ قائم کرو۔ یا اقتدار حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرو۔۔۔ اس کے برعکس اہل سیاست کی ساری تگ و دو کا مقصود اقتدار کا حصول ہوتا ہے۔ وہ اسی اقتدار کے حصول کے لئے اپنی تنظیم کرتے ہیں۔ اور اسی کے لئے لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ یہ مقصود ایک خالص دنیوی مقصود ہے لیکن بعض لوگ اس پر دین کا ملمع کر کے اس چیز کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ یہ اقتدار اپنے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے یا اس کے دین کے لئے چاہتے ہیں۔۔۔ (آگے جا کر لکھتے ہیں) "اہل سیاست جس دنیوی اقتدار کے حصول کو تمام خیر و فلاح کا ضامن سمجھتے یہاں تک کہ دین کی خدمت کا کوئی کام بھی ان کے نزدیک، اس وقت تک انجام ہی نہیں دیا جا سکتا۔ جب تک یہ اقتدار حاصل نہ ہو جائے۔ اس اقتدار کو انبیاء علیہم السلام نے اپنے نصب العین کے لئے نہایت خطرناک سمجھا ہے۔ جس کے داعی وہ خود رہے ہیں۔۔۔" (اس کے بعد انہوں نے اس کے ثبوت میں ایک

احادیث بھی نقل فرمائی ہیں۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ دونوں مضامین مولانا امین احسن اصلاحی کے ہوں۔ چونکہ رسالہ میثاق ان کا اپنا رسالہ ہے اس لئے مندرجہ بالا خیالات یقیناً مولانا امین احسن صاحب کے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا والے مضمون کے لکھنے والے کے نام میں کاتب نے غلطی کی ہے۔ اس لئے براہ کرم آئندہ پرچہ میں تصحیح فرما دیں۔ یا وضاحت فرمادیں کہ کیسے ایک ہی آدمی دو مختلف خیالات رکھ سکتا ہے۔ والسلام۔

غلام ربانی بی ۔ایسا ے۔ بی ٹی۔ واہ چھاؤنی

وضاحت ——!

"کارِ نبوت اور طریقِ نبوت" کے عنوان کے تحت جو مضمون ایشیا میں شائع ہوا ہے وہ مولانا امین احسن اصلاحی ہی کا ہے اور اس کے مضمون نگار کا نام لکھنے میں کاتب سے کوئی سہو سرزد نہیں ہوا۔ باقی رہا یہ امر کہ ایک ہی آدمی مختلف خیالات کیونکر ظاہر کر سکتا ہے اس کی وضاحت ہم سے متعلق نہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی کا یہ مضمون ان کی مشہور کتاب "حقیقتِ تقویٰ" کے آخری باب سے لیا گیا ہے یہ وہ حصہ ہے جس میں مولانا نے پوری کتاب کا عطر نکال کر رکھ دیا ہے۔ (ایشیا)

اقتباس بالا میں "وضاحت" کے تحت، مولانا اصلاحی صاحب کے جس مضمون کا ذکر کیا گیا ہے اس کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے۔

(مولانا صاحب طریقِ خانقاہیت پر تنقید کرنے کے بعد لکھتے ہیں) اس کے برعکس ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اصل کارفرما طاقت وقت کا سیاسی نظام ہے۔ جب تک اس کی اساس تقویٰ پر نہ ہو اس وقت تک لوگوں میں اوّل تو تقویٰ پیدا ہونا ناممکن ہے۔ اور اگر کسی طرح پیدا ہو جائے تو اس کا قائم رکھنا ناممکن ہے۔ اس وجہ سے ہم سب سے پہلے اس نظامِ فکر سے پنجہ آزمائی کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس پر وقت کا سیاسی نظام قائم ہے...... ہمارے نزدیک تقویٰ پیدا کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ یہی طریقہ ہم نے حضرات انبیاء کرام کی زندگیوں سے سمجھا ہے اور اپنی طاقت کے مطابق اسی پر چل رہے ہیں۔ (ایشیا۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۶۰ء)

اصلاحی صاحب نے یہ مضمون اس وقت لکھا تھا جب وہ رسالہ جماعت اسلامی سے منسلک تھے، اور جس مضمون کے اقتباسات پہلے دیئے گئے ہیں وہ اس جماعت سے علیحدگی کے بعد (اب) لکھا ہے۔ اُس وقت حضرات انبیاء کرام کا طریق کار وہ تھا جس پر اصلاحی صاحب اس وقت حامی تھے۔ اب حضرات انبیاء کرام کا طریق کار وہ ہے جس کے مبلغ اصلاحی صاحب اب ہیں۔

کس قدر صداقت ہے اس حقیقت میں کہ جب بھی کوئی شخص کسی مصلحت کو سامنے رکھ کر قرآن و سیرت انبیاء کرام کا مطالعہ کرتا ہے تو اس مصلحت کے بدلنے سے قرآن و سیرت کا مفہوم بھی بدل جاتا ہے۔ اس میں نہ کسی مودودی کی

تنقیص سے نہ اصلاح کی۔ ایشیا نے اصلاحی صاحب کا ایک تضاد نمایاں کیا ہے۔ مودودی صاحب کی ساری تصنیفات تضادات سے بھری پڑی ہیں۔ جتنی زیادہ مصلحتیں اتنے ہی زیادہ تضادات۔ ایشیا کو مودودی صاحب کے تضادات اس دن دکھائی دیں گے جس دن یہ ان سے الگ ہوگا۔

۲۔ مظلوم اسلام

۲۰ر دسمبر ۱۹۶۹ء کے پاکستان ٹائمز میں، جدہ سے آمدہ حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

ریڈیو مکہ کی اطلاع ہے کہ سعودی عرب کے شاہ سعود نے، ملک کو عبوری آئین دیا ہے جو اس وقت تک نفاذ پذیر رہے گا جب تک مجوزہ ملی اسمبلی جدید دستور مرتب نہ کرے۔ اس (عبوری) آئین کی دفعہ اول میں کہا گیا ہے کہ سعودی عرب، عظیم عرب قوم کے اندر، ایک آزاد اسلامی مملکت ہے جس کے حدود غیر منقسم ہیں اور جس کا نظام حکومت آئینی ملوکیت ہے۔

اس دستور کی دوسری دفعہ میں اس امر کا اعلان کیا گیا ہے کہ اس مملکت کا ریاستی (سرکاری) مذہب اسلام ہے۔

تیسری شق میں کہا گیا ہے کہ تخت کا وارث، (سابق) شاہ ابن سعود کے خاندان سے چنا جائے گا۔

یعنی موروثی ملوکیت جسے مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا اور جس کی ابتدا کرنے والوں پر آج تک لعنت کی جاتی ہے، سرزمین حجاز کی اس "اسلامی مملکت" کے آئین کی بنیادی شق قرار پاتی ہے جس کا سرکاری مذہب اسلام بتایا گیا ہے۔ اور اس پر کسی حامیٔ دین متین کی رگ حمیت میں حرکت یا حرارت پیدا نہیں ہوتی!

اسلام بھی دنیا میں کس قدر مظلوم ہے کہ جو کسی کے جی میں آئے اس بیچارے کی طرف منسوب کر دے۔ اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

۳۔ حقیقی مسرت

موقر جریدہ نوائے وقت کی ۲۶ر دسمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں "سچی باتیں" کے عنوان کے تحت (جو غالباً صدق لکھنؤ سے لیا گیا ہے) حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔ ذیلی عنوان ہے "اتحاد کی طرف"

شیعی دنیا کے نامور فاضل شیخ محمد حسین آل کاشف الغطا کی کتاب اصل الشیعہ و اصولہا کے اردو ترجمہ اصل و اصول شیعہ سے بہ سلسلہ نبوت و قرآن

وہ کتاب جو اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے یہ وہی ہدایت نامہ ہے جسے پروردگار عالم نے معجزہ بنا کر نازل کیا اور اس کے ذریعہ احکام دین کی تعلیم دی۔ نہ اس میں کوئی کمی ہوئی نہ زیادتی۔ مسلمانوں میں جو لوگ تحریف کے قائل ہیں وہ خطا پر ہیں۔ کیونکہ اس اعتقاد سے نص کتاب انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون کی تردید ہوتی ہے۔

(صفحہ ۶۳، ناشر۔ رضا کار، بک ڈپو۔ لاہور)

ہر کلمہ گو فرقہ کو دوسرے فرقوں سے متحد کرنے کی ضرورت اگر پہلے ایک درجہ میں تھی تو اب اس سے پچاس گنی سوگنی بڑھ گئی ہے اور قرآن مجید کی سالمیت پر ایمان وایقان کی آواز جس سمت سے بھی آجائے، اس کا استقبال دلی مسرت سے کرنا چاہیئے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ قرآن کریم کی سالمیت کے اعتراف میں جس سمت سے بھی آواز آئے اس کا استقبال دلی مسرت سے کرنا چاہیئے، لیکن حقیقی مسرت اس دن ہوگی جب اس کی سالمیت کا اقرار کرنے والے (مسلمانوں کے مختلف فرقے) اسے اپنے معتقدات اور اعمال کی صحت کا معیار بھی قرار دے لیں۔ جس دن ایسا ہوگا اس دن فرقے بھی باقی نہیں رہیں گے۔

۴۔ عمل سے فارغ ہوا مسلماں ......

معاصر ترجمان اسلام، لاہور کی ۱۹ راگست ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں "اقوال زریں" کے تحت، (کسی بزرگ کا) ایک قول یہ بھی درج ہے۔

بُرے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا بُرے عمل کرنے سے بدتر ہے۔

اولیاء اللہ کی صحبت میں بیٹھنا اچھے عمل کرنے سے بہتر ہے۔

چلیئے! "آمنوا" کے ساتھ "عملوا الصالحات" کی قرآنی تاکید سے یوں چھٹی ہوئی۔ اسی سلسلہ میں ایک اور دلچسپ قول بھی ملاحظہ فرمایئے۔ لکھا ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ شیطان کو دیکھا تو فرمایا۔ تو زیادہ کس شخص کو دشمن جانتا ہے۔ اس نے کہا میں زاہد کنجوس کو بہت دوست رکھتا ہوں۔ کیونکہ وہ بڑی محنت سے عبادت کرتا ہے۔ اور کنجوسی اس کی تمام عبادت کو ضائع کردیتی ہے۔ اور فاسق گناہگار سخی کو میں بہت دشمن رکھتا ہوں جو عیش کرتا ہے اور مزے لیتا ہے۔ لیکن مجھے ڈر رہتا ہے کہ کہیں سخاوت کی وجہ سے حق تعالیٰ اس کے گناہ بخش دے اور توبہ اس کی قسمت میں ہوجائے۔

ظاہر ہے کہ یہ قول، لوگوں کو سخاوت کی ترغیب دینے کے لئے وضع کیا گیا ہے (اور اسے منسوب، ایک نبی کی طرف کیا گیا ہے۔ نہ معلوم اس نسبت کی سند کیا ہے) مطلب یہ ہے کہ تم اپنے فسق و فجور کی پرواہ نہ کرو۔ تمہاری سخاوت کے بدلے میں، خدا تمہارے گناہ بخش دے گا۔ تم قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرتے رہو لیکن (جمعرات کے روز) فقیروں میں چنے اور پیسے بانٹ دیا کرو اور مسجد میں پلاؤ کی دیگ بھیج دیا کرو، تو تمہارے سب گناہ معاف ہوجائیں گے۔ یہی وہ لائسنس ہے جو ہمارے یہاں کے بلیک مارکٹ کرنے والوں۔ اسمگلروں، رشوت خوروں اور دیگر بددیانتی سے روپیہ کمانے والوں کو ان بارگاہوں سے بآسانی مل جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم کا فیصلہ یہ ہے کہ

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (۵/۲۷)

"اللہ صرف متقیوں سے (ایثار و قربانی) قبول کرتا ہے۔"

باب المراۃ

ایک طاہرہ بیٹی کا خط

ہمارے اچھے باباجی!

میں آپ کی ایک "طاہرہ بیٹی" ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کی بچیاں آپ کو "باباجی" کہہ کر پکارتی ہیں۔ میں بھی آپ کی بچی ہوں اس لئے میں نے بھی آپ کو اسی القاب سے خطاب کرنا اچھا سمجھا ہے۔ میں کافی عرصہ سے آپ کے قرآنی خیالات سے متاثر ہوں۔ میں آپ کو پہلی مرتبہ خط لکھ رہی ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ خطاب آپ کے لئے راحت کا موجب نہیں پریشانی کا باعث ہوگا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ بیٹیاں ماں باپ کے لئے ہوتی ہی پریشانی کا باعث ہیں۔ میں اس سے مستثنیٰ کیسے ہو سکتی ہوں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ لڑکیوں کو خدا پیدا ہی پریشانی کا موجب بننے کے لئے کرتا ہے۔ (کبھی میرا بھی یہی خیال ہوتا تھا لیکن آپ کی تعلیم کے بعد یہ خیال باقی نہیں رہا)۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے موجودہ معاشرہ میں لڑکیاں ہوتی ہی پریشانی کا موجب ہیں۔ یہ پیدا ہوتی ہے تو گھر میں سوگ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس کا گلا گھونٹ دینا قانوناً جرم ہے اس لئے اسے زندہ رہنے دیا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جسے اس مجبوری کے ماتحت زندہ رکھا جائے اس کی گھر میں کیا قدر ہو سکتی ہے۔ یہ جوں جوں بڑی ہوتی جاتی ہے، ماں باپ کی چھاتی پر بوجھ بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی پرورش کی جاتی ہے تو اس لئے کہ یہ "پرایا دھن" ہوتی ہے۔ یعنی دوسروں کا مال جو ان کے پاس بطور امانت رکھا ہوتا ہے اور اس امانت کی حفاظت ان کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس کی ہر نقل و حرکت پر اس طرح کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے جس طرح جیل خانہ کا داروغہ، ناقابل اعتبار قیدیوں پر خاص نگاہ رکھتا ہے۔ اس کی ماں سے جب کوئی ملنے والی گلہ کرتی ہے کہ وہ اتنے عرصہ سے ملنے تک کے لئے بھی نہیں آئی تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی ہے کہ بہن! میں اب کہاں نکل سکتی ہوں۔ گھر میں جوان بیٹی ہے۔ "آئے کا دیا۔ اندر رکھو تو چوہوں کا ڈر۔ باہر رکھو تو کوؤں کا خطرہ"۔ اس ہر وقت کے خطرہ سے بچنے کی ایک ہی صورت ہوتی ہے کہ اور وہ یہ کہ اسے جتنی جلدی ہو سکے دھکا دیکر دوسروں کے حوالے کر دیا جائے اور اس طرح اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے۔ جیسے اس طرح دھکا دیکر نکالا جائے، دوسروں کے ہاں اس کی جس قدر عزت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ جس بوجھ کو اس طرح سر سے اتار کر پھینکا جائے اسے دوسرا جس خوشی سے اٹھاتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔ وہاں اس پر جو کچھ بیتتی ہے اسے

اس کے سوا کوئی دوسرا جان ہی نہیں سکتا۔ ساری دنیا میں اُسے ایک ماں ایسی نظر آتی ہے جس سے کچھ دُکھ سکھ کہہ سکے۔ لیکن جب یہ اس سے کوئی شکایت کرتی ہے تو وہ جواب میں کہتی ہے کہ، خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرو کہ اس نے تمھیں ایسا گھر دیا ہے تمھیں کیا پتہ ہے کہ پرائے گھروں میں کیا کیا دُکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ اس کا مجھ سے پوچھو۔ جو دُکھ میں نے اٹھائے ہیں اس کا تم سے ذکر کروں تو تمھارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ تم تو ٹھنڈے دودھ کو پھونکیں مارتی ہو۔" (معاف رکھنا۔ باباجی! مجھے پنجابی محاوروں کا اردو میں ترجمہ کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن ترجمہ میں وہ بات کہاں جو اصل میں ہوتی ہے۔ لیکن آپ تو ان محاوروں کو اچھی طرح جانتے ہوں گے) وہ یہ کہہ کر اُلٹا اسے ہی مورد الزام قرار دیتی ہے۔ اور جاتے وقت تلقین کرتی ہے کہ خوشی کی زندگی جینا چاہتی ہو تو ہر ایک کی فرمانبرداری کرو۔ جو کچھ بیتے اسے "شکر الحمدللہ" کہہ کر سہتے جاؤ۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ خاوند "مجازی خدا" ہوتا ہے۔ ہمارے رسولِ خدا نے فرمایا ہے کہ اگر کسی انسان کا دوسرے انسان کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ خاوندوں کو سجدہ کیا کریں۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہے کہ حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو پیٹتا ہے تو کسی شخص کو اس سے پوچھنا نہیں چاہیئے کہ وہ اسے کیوں پیٹتا ہے۔ اس لئے بیٹی! جو کچھ خاوند کہے وہ کرو۔ جو حکم وہ دے اس کی تعمیل کرو۔ وہ جہاں بٹھائے وہاں بیٹھو۔ جہاں سے اٹھائے وہاں سے اٹھ جاؤ۔ جو فیصلہ وہ کرے اس کے خلاف کوئی لفظ زبان سے نہ نکالو۔ خاوند کی تابعداری سے عورت سب کچھ پا سکتی ہے۔ تمھیں پتہ ہے حضرت رابعہ بصری کو اولیائی کس طرح سے ملی تھی؟ ان کے خاوند نے پانی مانگا۔ وہ پانی کا کٹورا لیکر پہنچیں تو وہ سو چکے تھے۔ وہ کٹورا ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر سردیوں کی ساری رات خاوند کے سرہانے کھڑی رہیں۔ صبح کے وقت خاوند کی آنکھ کھلی تو اُس نے پانی پیا۔ اُدھر اس نے پانی پیا اور اِدھر حضرت رابعہ بصری کو اولیاء کا مرتبہ مل گیا۔ اس لئے بیٹی! آج تو تم نے کہا ہے۔ اس کے بعد کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لانا۔ آجکل کی لڑکیوں پر خدا کی مار۔ وہ بات بات پر شکایت کر دیتی ہیں۔ اسی لئے رسولِ خدا نے معراج کی رات کو دیکھا تھا کہ دوزخ میں عورتوں کی کثرت تھی۔

وہ ماں کی یہ نصیحتیں سن کر پھر واپس چلی جاتی ہے اور جو کچھ اس پر بیتتی ہے وہ اس طرح سہتی ہے کہ اونچا سانس نہیں لیتی۔ کہتے ہیں کہ جب لوگ مردے کو دفن کر کے لوٹتے ہیں تو منکر نکیر آکر اسے گرزوں سے مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ چیختا چلاتا ہے لیکن باہر والے کوئی اس کی آواز نہیں سن سکتے حالانکہ وہ ان کی جوتیوں کی آہٹ بھی سن رہا ہوتا ہے۔ باہر والے چالیس قدم پر جا کر اس کے حق میں دعائے خیر کر کے اطمینان سے واپس آجاتے ہیں اور پھر اُسے ان کے پاؤں کی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی مردے پر یہ کچھ اس طرح بیتتی ہے یا نہیں، اس کا تو مجھے علم نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ہماری شادی شدہ لڑکیوں کا تمثیلی بیان ہے۔

معاف رکھئے۔ باباجی! میں نے خط شروع کیا تھا اپنی داستان سنانے کے لئے اور لے بیٹھی دوسروں کی رام کہانی۔ لیکن یہ رام کہانی بھی دوسروں کی نہیں۔ اسے بھی میری ہی داستان کا حصہ سمجھئے۔ میں نے قریب چوبیس سال کی عمر میں

ایم۔ اے کیا۔ یوں تو یہ دو ایک سال پہلے بھی ہو جاتا کیونکہ میں بہت ہونہار طالب علم تھی لیکن میرے دو تین سال شروع میں بیماری کی نذر ہو گئے۔ جب تک تعلیم جاری تھی مستقبل کا کوئی خیال تک ذہن میں نہیں آتا تھا۔ اس وقت تو مستقبل اسی کا نام تھا کہ امتحان پاس کر لیا جائے۔ ایک امتحان پاس کر لیا جاتا تو دوسرا امتحان "مستقبل" بن جاتا۔ لیکن جب آخری امتحان پاس کر لیا۔ تو پھر "میرے مستقبل" کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ والدہ نے چپکے چپکے اباجی سے کہنا شروع کر دیا کہ "لڑکی کو کب تک گھر میں بٹھائے رکھو گے۔ آپ کے پڑھانے کے "جہاد" نے پہلے ہی اس کا سر سفید کر دیا ہے۔ اب اور کتنا انتظار کرنا ہوگا؟" اب جو بر کی تلاش شروع ہوئی تو اور مصیبت سامنے آئی۔ ہمارے ہاں عام طور پر لڑکی اور لڑکے کی عمر میں پانچ سات سال کا فرق رکھا جاتا ہے۔ لڑکا، لڑکی سے اتنا بڑا ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اس معیار کے مطابق، چوبیس پچیس سال کی لڑکی کے لئے تیس بتیس بتیس کا لڑکا تو ہونا چاہیئے۔ اول تو وہ کونسا لڑکا ہے جو تیس بتیس سال کی عمر تک انتظار کرتا رہے گا کہ ملنے والی بیوی ایم۔ اے کر لے تو وہ شادی کا خیال کرے؟ اس عمر تک بن بیاہا وہی رہ سکتا ہے جسے کوئی اچھا رشتہ دینا نہ چاہے۔ لہذا پہلے تو یوں انتخاب کا دائرہ تنگ ہوا۔ آگے بڑھے تو یہ سوال سامنے آیا کہ لڑکا زیادہ نہیں تو لڑکی جتنا تعلیم یافتہ تو ہو۔ اب ظاہر ہے کہ تیس بتیس سال کا ایم۔ اے پاس نوجوان سروس میں ہوگا تو چھ سات سال کی اس کی ملازمت ہو چکی ہوگی۔ وہ کونسا لڑکی والا ہے جسے اس قسم کے رشتہ کی تلاش نہ ہوگی۔ لہذا اب لڑکی والوں میں باہمی مقابلہ (competition) ہوگا جو زیادہ دام دے، وہی لڑکا خرید سکے۔ اباجی متوسط الحال ملازمت پیشہ تھے۔ جو کچھ بچا وہ میری (اور دو تین اور بھائی بہنوں کی) تعلیم میں لگا دیا۔ اب ان کے پاس اتنا کہاں تھا کہ وہ بڑھ چڑھ کر بولی دے سکتے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ سوت کی انٹی سے یوسف نہیں خریدا جا سکتا اس سے جو کچھ مل سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ وہی کچھ ملا۔ (میں یہ چیز بطور شکایت نہیں لکھ رہی کیونکہ امی جان نے شکایت کرنے سے منع کر رکھا ہے) میں نے دیکھا کہ میری چچیری، ممیری بہنیں، جن کی شادی سولہ سولہ، اٹھارہ اٹھارہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی، اس بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ خوش نصیب تھیں۔ انھیں واقعی نسبتاً اچھے خاوند مل گئے تھے۔ بات تھی بھی ٹھیک۔ لڑکی کے انتخاب کے لئے عمر خاص اہمیت رکھتی ہے۔

سسرال میں پہنچی تو یہ حقیقت کھلی کہ میرا "ایم۔ اے" کا سارٹیفکٹ وہ جنس کاسد ہے جس کا کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ میں بار بار سوچتی کہ میں نے بالآخر ایم۔ اے کیا کس لئے تھا؟ وہ میرے کسی کام آتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے برعکس وہ سراسر میرے خلاف جاتا تھا۔ چنانچہ پہلے ہی مہینے میں ساس نے پڑوسن سے کہنا شروع کر دیا کہ "بتاؤ کبھی ماں نے لاڈو گھر بیٹھا رکھا تھا۔ بیوی کیا میم صاحب بنانے کا۔ نہ ہانڈی روٹی کا ڈھنگ۔ نہ سینے پرونے کا سلیقہ۔ جہیز میں کتابوں کا بکس اور تصویروں والے رسالوں کی الماری لائی ہے۔ بوڑھی ساس پکایا کرے گی اور بہو اپنے میاں کو ناول پڑھایا کرے گی۔" وہ بیچاری بھی سچی تھیں۔ اس قسم کی بہو ہوتی کس کام کی ہے؟ میرے میاں شریف انسان ہیں —— بہت نیک اور شریف۔ ہمارے ہاں شریف

اب تک اسے کہتے ہیں کہ جب ماں باپ نے اسے بیوی کے خلاف بھڑکایا تو ان سے دب گئے (اس لئے بھی کہ "ماں باپ کی اطاعت بہرحال فرض ہے") اور جب بیوی نے تنہائی میں پوچھا کہ میرا بالآخر کیا قصور ہے جس کی پاداش میں مجھے یوں ذلیل کیا جاتا ہے، تو نگاہیں نیچی کرکے کہہ دیا کہ "تم میری مجبوری کو بھی تو دیکھو!" ماں باپ اپنی عادت سے مجبور۔۔۔ بیٹا اپنی شرافت سے مجبور۔۔۔ یہ سب مجبور، اور ان میں "صاحبِ اختیار" یہ باہر سے آنے والی!! لیکن یہ نگاہیں نیچی کرکے مجبوری کا اعتراف بھی شروع میں چند دن تک تھا۔ اس کے بعد "الرجال قوامون علی النساء" کے غلط مفہوم کا پیدا کردہ (یا تقویت دادہ) احساس، جو تحت الشعور میں کروٹیں لے رہا تھا، بیدار ہونا شروع ہو گیا۔ اس کے بعد میاں بہرحال میاں تھا اور بیوی بہر نوع بیوی۔ ٹیڑھی پسلی سے پیدا شدہ عورت جسے سیدھا کرنا چاہو تو وہ ٹوٹ جائے لیکن سیدھی نہ ہو۔ اس کی "تریاہٹ" ضرب المثل ہوتی ہے۔ یعنی عورت اگر کسی اصول پر قائم رہنا چاہے تو ضدی کہلائے اور مرد اپنی ضد نہ چھوڑے تو اصول پرست کہلائے۔ عورت معقول سے معقول بات بھی کرے تو ناقص العقل قرار دی جائے۔ مرد، اپنی حماقتوں کی وجہ سے ہر ایک سے ڈانٹ کھائے تو بھی گھر پہنچ کر لقمان حکیم بن جائے۔ اور یہ اس احساس کی بنا پر کہ مرد بہرحال عورت سے افضل ہے اور اس پر حاکم اور داروغہ۔

یہ ہے درحقیقت وہ نقطہ جس کے لئے، باباجی! میں نے یہ طویل داستان دہرائی ہے۔ اگر اس مقام پر میری جرأت حیطۂ ادب سے کچھ آگے بڑھ جائے تو اپنی بیٹی کو معاف فرما دیجئے گا۔ میرا اندازہ یہ ہے (اور یہ اندازہ ذاتی تجربہ اور اپنی سہیلیوں کے حالات کا گہرا مشاہدہ کرنے کا نتیجہ ہے) کہ مرد کے دل سے، عورت پر تغلب (Domination) کا جذبہ، جو نہ معلوم شروع میں کن حالات کے ماتحت پیدا ہوا تھا، آج تک جا ہی نہیں سکا۔ مرد جاہل ہو یا تعلیم یافتہ۔ "مہذب" ہو یا غیر مہذب۔ حتیٰ کہ کماؤ ہو یا نکھٹو۔ عورت کو اپنے حکم کے تابع رکھنے کا جذبہ ہر ایک کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ حالات کے مطابق اس کے مظاہر کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ جذبہ اپنی جگہ باقی رہتا ہے۔ بھولی لڑکیاں جب دیکھتی ہیں کہ خاوند ان کی ہر فرمائش کو پورا کرتا ہے۔ ان کے لئے اچھے اچھے کپڑے اور قیمتی زیورات لاتا ہے۔ ہر تقریب میں انہیں آگے بڑھاتا ہے اور خود پیچھے رہتا ہے۔ بیوی کا اوور کوٹ لیکر اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ تو وہ سمجھتی ہیں کہ وہ واقعی بیوی (یعنی عورت) کی عزت (Respect) کرتا ہے۔ لیکن یہ عزت نہیں ہوتی۔ اچھے اچھے کپڑوں اور زیورات کو تو یوں سمجھئے جیسے بچیاں اپنی گڑیوں کو کپڑے اور زیورات پہنا کر اپنے ذوق کی تسکین کرتی ہیں۔ (کہنے کو تو اور کچھ بھی جی چاہتا ہے لیکن آپ کا احترام مانع ہے)۔ باقی رہا تقریبوں میں بیوی کی عزت، سو وہ محض سوسائٹی میں مہذب کہلانے کے فیشن کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے آپ نے ایک خط میں (Ego) کی تسکین کہا تھا۔ مرد صرف اپنے (Ego) کی تسکین چاہتا ہے اور عورت اس تسکین کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس میں عزت (Respect) کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ عزت (Respect) دیکھنی ہو تو تنہائی میں دیکھئے جہاں وہ اپنا فیصلہ منوانے کے لئے اس قدر غیر معقول

(Un-Reasonable) ہو جاتا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

بعض درندوں کے متعلق سنا ہے کہ انہیں شکار کو مار کر کھانے میں اتنا مزہ نہیں ملتا جتنا مزہ اسے دبوچ کر ستانے میں ملتا ہے۔ درندوں کے متعلق تو میں کہہ نہیں سکتی لیکن مرد کی تو بالکل یہی حالت ہے۔ وہ نکاح میں عورت کے "ہاں" کہنے تک تو ہر شرط مانتا چلا جاتا ہے لیکن اس کے بعد جب وہ اسے دبوچ لیتا ہے تو پھر اسے ستانے میں بڑی لذت لیتا ہے اور وہ لاکھ جتن کرے، اسے اپنے پنجہ کی گرفت سے چھوڑنے پر کبھی تیار نہیں ہوتا۔ جب تک عورت پھڑپھڑاتی رہے گی وہ اسے ستاتا رہے گا۔ "گھر میں چین" اس وقت نظر آئے گا جب وہ (COMPLETE SBRRENDER) کر جائے گی۔ یعنی جس طرح مر جانے کو ہر مرض سے آرام اور ہر تکلیف سے راحت مل جاتی ہے اُسی طرح عورت کے دکھوں کا بھی یہی علاج ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو میں سمجھتی ہوں کہ ہمارے قدیم جاہلیت کے ماحول میں پرورش یافتہ لڑکیاں بہت اچھی رہتی تھیں۔ انہیں شروع ہی سے اس قسم کی زندگی کے لئے ذہنی طور پر تیار کیا جاتا تھا۔ اور وہ اس "موت" کو عین حیات سمجھتی تھیں۔ لیکن مصیبت ان کی ہے جنہیں موت اور حیات کا فرق بتانے کے بعد ان سے کہا جاتا ہے کہ موت کو حیات سمجھو اور ہنس ہنس کر جیو۔ شودر کو جب تک یہ تعلیم دی جائے کہ وہ برہما کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے اور اس کی مکتی (Salvation) کا راز اسی میں ہے کہ وہ برہمن کی سیوا کرے، اس کے لئے شودر کی زندگی دوبھر نہیں ہوتی۔ لیکن جب اسے یہ بتا دیا جائے کہ شودر اور برہمن دونوں برہما کے ہاتھوں کے بنے ہوئے ہیں تو پھر اس کے لئے شودر بن کر رہنا عذاب جان ہو جاتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ شودر کو یہ بتایا نہ جائے کہ وہ اور برہمن ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شودر کو یہ بتانے سے پہلے، برہمن کو یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ برہما کے سر سے اور شودر اس کے پاؤں سے پیدا نہیں ہوتے۔ دونوں اس کے ہاتھوں کی تخلیق ہیں۔ جب برہمن کے سر سے برہمن ہونے کا سودا نکل جائے تو پھر شودر کو بھی انسان ہونے کا سراغ دینا چاہیئے۔ معلوم نہیں کہ میں اپنے مطلب کو واضح کر سکی ہوں یا نہیں۔ لیکن میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ جب تک پہلے مرد کے ذہن سے یہ خیال نہ نکالا جائے کہ وہ عورت سے افضل اور اس پر حاکم ہے، اس وقت تک عورت کو یہ بتانا کہ وہ مرد کے ہمدوش چلنے کے لئے بنائی گئی ہے اور وہ "انسان" ہونے کی جہت سے ایسی ہی واجب التکریم ہے جیسا مرد، اس بچاری کے لئے آفت کا سامان پیدا کر دینے کے مترادف ہے۔ مجھے خطرہ نظر آتا ہے کہ اگر ہمارے ہاں مردوں کی ذہنیت میں یہ تبدیلی نہ ہوئی تو یہاں بھی ہماری نئی پود کی لڑکیاں اسی انتقامی جذبہ کا شکار ہو جائیں گی جس نے یورپ کی عورت کو تفریط کے دوسرے سرے پر پہنچا دیا ہے اور اب وہ مرد پر (Dominate) کرنے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ حالانکہ (Domination) کا جذبہ، خواہ وہ مرد میں ہو خواہ عورت میں، انسانیت کے لئے تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ انسانیت کی فلاح، تکریم آدمیت میں ہے۔ یعنی مرد کے دل میں عورت کی (Respect) اور عورت کے دل میں مرد کی (Respect) اور یہ (Mutual respect) صرف مساوات کے

احساس سے پیدا ہو سکتی ہے، برتری اور تغلب کے جذبہ سے نہیں۔

میں اس سوال پر اکثر غور کرتی رہی ہوں کہ مرد نے عورت کو مغلوب رکھنے کے لئے جو حربے استعمال کئے ہیں ان میں سب سے زیادہ مؤثر حربے کونسے ہیں۔ تاریخ اور معاشیات میرے موضوع رہے ہیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ ان میں دو حربے بہت زیادہ کارگر ثابت ہوئے ہیں، اول، عورت کو معاشی طور پر محتاج بنا دینا (Economic Dependance) عورت کو بچوں کی پیدائش اور پرورش کے سلسلہ میں جو فطری فرائض سرانجام دینے پڑتے ہیں، مرد نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ جو لڑکیاں خود کمانے کے قابل ہوتی ہیں شادی کے بعد ان کا تجربہ کیا ہوتا ہے۔ یعنی ان کی (Married Life) کامیاب ہوتی ہے یا نہیں اور اس سے مرد کا تغلب کا جذبہ ختم ہوتا ہے یا نہیں۔ مجھے اس کے مطالعہ کا موقعہ نہیں ملا۔ اس ضمن میں شاید کوئی "طاہرہ بہن" جنہیں اس کا ذاتی تجربہ ہو، حتمی طور پر کچھ کہہ سکیں لیکن عورت کی معاشی احتیاج سے مرد جس طرح بری طرح فائدہ اٹھاتا ہے اسے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں۔ دوسرا حربہ یہ ہے (اور اسے میں آپ سے بصد معافی عرض کرنے کی جرأت کرتی ہوں، کیونکہ بیٹیوں کا باپ سے بھی اس موضوع پر گفتگو کرنا مستحسن خیال نہیں کیا جاتا۔ لیکن اس کے سوا مجھے کوئی چارہ نظر نہیں آتا)۔ دوسرا حربہ یہ ہے کہ مرد نے عورت کے لئے (SEX) کو ہوا بنا رکھا ہے۔ اس نے اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں کر رکھا ہے کہ وہ مرد کے بغیر زندگی گذار ہی نہیں سکتی۔ اگر وہ ایسا کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو اس کے لئے ہر وقت "عصمت" کا خطرہ ہے۔ اور اگر وہ اس کی بھی حفاظت کر لے تو اسے طرح طرح کی بیماریاں لگ جاتی ہیں۔ میرے خیال میں یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ عورت اپنی عصمت کی پوری حفاظت کر سکتی ہے۔ وہ چاہے تو ان جذبات سے کبھی مغلوب نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے صرف پاکیزہ خیالات کی ضرورت ہے۔ اور یہ چیز انسان کے اپنے بس کی بات ہے۔ باقی رہا اس ضبط سے بیماریوں کا خطرہ۔ سو یہ بھی بے بنیاد ہے۔ اس سے تو بلکہ اس کی توانائیوں اور صلاحیتوں میں اضافہ ہونا چاہیئے۔ یہ خطرہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ جنسی خیالات سے اپنے اعصاب (Nerves) میں اشتعال پیدا کرتی رہے اور پھر اس کی تسکین کا صحیح سامان نہ پائے۔ (اس میں بھی میرا خیال ہے کہ مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں) اگر وہ اپنے خیالات میں پاکیزگی رکھتی ہے تو پھر اسے اعصابی یا دیگر اس قسم کی بیماریوں کا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس موضوع پر جو کچھ پڑھا ہے وہ میرے اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ اس لئے عورت کو اس ہوا کو دل سے نکال دینا چاہیئے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ عورت کے سامنے زندگی کا کوئی بلند مقصد ہو۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ ہماری لڑکیاں تجرد کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیں۔ مطلب صرف یہ ہے کہ اگر بعض اوقات حالات ایسے پیدا ہو جائیں جن میں تجرد کی زندگی ہی مناسب (یا قرین مصلحت) ہو تو یہ خیال اس کے مانع نہیں ہونا چاہیئے۔ باقی رہا افزائش نسل کا سوال، سو یہ بھی ضروری ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جو عورت ہزار بچوں کو انسان بنانے اور

سینکڑوں خاندانوں کے دکھ درد مٹانے کی صلاحیت رکھتی ہو، اس کے لئے چار بچوں کی ماں بن کر اپنی ساری صلاحیتوں کو اس میں صرف کر دینا، فطرت کے عطیہ کا صحیح مصرف قرار نہیں پا سکتا۔ میں اپنے بچوں کی پرورش کر رہی ہوں لیکن میں پوری شدت سے محسوس کر رہی ہوں کہ میری صلاحیتوں کا صرف اس قدر مصرف، ان کا ضیاع ہے۔ میں اس سے کہیں زیادہ انسانیت کی خدمت کر سکتی تھی۔ لیکن بچے خواہ دو ہی کیوں نہ ہوں، کسی اور طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں دیتے۔ یہ بھی ہمارے ہاں کی غلط طرز زندگی کا نتیجہ ہے لیکن جب تک یہ طرز بدلا نہیں جاتا اس سے مفر نہیں۔

معاف فرمایئے کہ خط بہت لمبا ہو گیا لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ (اسے میں نے لکھا بھی تو کئی مہینوں کی سوچ بچار کے بعد ہے)۔ میں دریافت یہ کرنا چاہتی ہوں کہ

(۱) حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد میں جن نتائج تک پہنچی ہوں، آپ کے خیال میں وہ کہاں تک درست ہیں۔

(۲) کیا میرے خیالات میں کوئی بات ایسی تو نہیں جو قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف جاتی ہو۔ اس لئے کہ ہمارے خیالات، یا مطالعہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں، اگر وہ قرآن مجید کے خلاف ہیں تو ہمیں یہ کہہ کر انھیں بدلنا ہوگا کہ ہمارے خیالات خام اور مطالعہ ہنوز ناقص ہے۔

(۳) ہماری لڑکیوں کے ان مسائل (PROBLEMS) کا حل کیا ہے؟ ان کی تعلیم سے مقصد کیا ہے؟ کیا عورت کا صرف یہی منصب (ROLE) ہے کہ وہ (HOUSE-WIFE) بنکر زندگی گذارے یا اگر وہ اس سے بہتر فرائض سرانجام دے سکتی ہے تو وہ ان فرائض کو سرانجام دے۔؟

بہتر ہو کہ آپ اس خط کا جواب طلوع اسلام کے ذریعے دیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میری اور "طاہرہ بہنیں" بھی ان مسائل سے دلچسپی لیں۔ شاید اس طرح باہمی سوچ بچار اور آپ کی راہ نمائی سے ہم کسی حد تک اپنی اور اپنی بچیوں کی زندگی خوشگوار بنا سکیں اور ملت اور دین کے لئے کچھ مفید بن سکیں، ورنہ اس وقت تو حالت یہ ہے کہ ہماری زندگی اجیرن اور دوسروں کے لئے بوجھ ہے۔

ہزار احترام اور دعاؤں کے ساتھ

آپ کی بیٹی "طاہرہ"

میری عزیز بیٹی ـــــ خدا تمھیں خوش و خرم رکھے۔

"طاہرہ بیٹیاں" میرے لئے بمنزلہ میری اولاد کے ہیں۔ اس لئے ان کا حق ہے کہ مجھے باپ کہہ کر پکاریں قرآن کا رشتہ، خون کے رشتے سے کہیں زیادہ گہرا اور محکم ہوتا ہے۔ ان بیٹیوں سے میری بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

(۲) سب سے پہلے میں دلی سپاس کہا دیتا ہوں تمھارے ماں باپ کو جنھوں نے تمھاری ایسی عمدہ تربیت کی۔ اور پھر تمھارے

موجودہ گھرانے کو جنہیں اس قسم کی شمعِ نورانی میسر آگئی مستحق ہزار تبریک و تہنیت ہے وہ ملت جس میں تمہاری جیسی بیٹیاں پیدا ہوں۔ اگر تمہارے خیالات کی نشوونما میں میری قرآنی فکر کا بھی کچھ دخل ہے تو میں اپنے آپ کو بھی جس قدر خوش قسمت سمجھوں کم ہے۔ تمہارے جیسی بیٹیاں ہی درحقیقت میری جگر کاویوں کا صلہ ہیں۔ خیالات کی بلندی اور پاکیزگی تو تمہاری صحیح تربیت کا اثر ہے لیکن ان کے اظہار پہ اس قدر قدرت، تمہاری تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اس اعتبار سے تمہارا ایم۔ اے کرنا رائیگاں نہیں گیا۔ میں حیران ہوں کہ تم اتنا عرصہ چھپی کہاں رہیں؟ تمہیں بہت کچھ لکھنا چاہیئے تھا اور اس کی ابتدا بہت پہلے کر دینی چاہیئے تھی۔ تم مجھے اپنا پتہ لکھ دیتیں تو اچھا ہوتا تاکہ میں تمہیں مجبور کرکے بھی تم سے ان موضوعات پر مسلسل لکھواتا رہتا۔ جہاں تم اتنی "مجبوریاں" پہلے برداشت کر رہی ہو، ان میں ایک اور کا اضافہ ہو جاتا۔ اب بھی، میری بیٹی، تم اس خط پر بس نہ کر دینا۔ تمہیں فطرت نے بڑی صلاحیتیں دی ہیں۔ ان کی نمود کے جس قدر مواقع بھی مل سکیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اگر موجودہ غلط معاشرے کو یک بیک بدل دینا ہمارے بس میں نہیں، تو کم از کم، میسر آجانے والے مواقع سے فائدہ اٹھانے میں تو ہمیں کوتاہی نہیں کرنی چاہیئے۔

(۳) تمہارا مطالعہ بڑا وسیع۔ تمہارے مشاہدات بڑے عمیق اور تمہارے نتائج بڑے صحیح ہیں۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ان میں کوئی چیز قرآنی تعلیم کے خلاف نہیں۔ یہی نہیں۔ بلکہ تم قرآن کے منشاء و مقصود کو جس عمدگی سے سمجھی ہو، بایدوشاید۔ اللہ تمہارے قرآنی ذوق میں برکت عطا فرمائے۔ تمہیں اس کے مواقع دے کہ تم دوسروں میں بھی اس ذوق کو بیدار یا پیدا کر سکو۔

(۴) غلام قوم کی ذہنیت "بھیڑ چال" کی سی ہو جاتی ہے۔ وہ کوئی کام خود سمجھ سوچ کر نہیں کرتی بلکہ محض دوسروں کی دیکھا دیکھی کرتی رہتی ہے۔ ہماری یہی ذہنیت، زندگی کے اور شعبوں کی طرح، لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلہ میں بھی کارفرما ہے۔ چونکہ لڑکیوں کو تعلیم دلانا ہمارے ہاں فیشن سا ہو گیا ہے اس لئے ہر باپ اپنی بچی کو سکول بھیج دیتا ہے اور کبھی نہیں دیکھتا کہ اسے وہاں تعلیم کس قسم کی مل رہی ہے۔ اس کے بعد اسے کالج میں داخل کرا دیتا ہے، یہ سوچے بغیر کہ اس سے بالآخر مقصد کیا ہے۔ میں لڑکی کو بنانا کیا چاہتا ہوں۔ تعلیم کے بعد اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ ان باتوں کے متعلق نہ ماں باپ سوچتے ہیں اور نہ ہی جن کے ہاتھ میں تعلیم کا سررشتہ ہے، وہ غور کرتے ہیں کہ لڑکیوں کی تعلیم سے غرض و غایت کیا ہے اور درسگاہوں کا فریضہ اور ذمہ داری کیا۔ لڑکوں کے معاملہ میں تو میکالے اور اس کے ہم نواؤں کی پالیسی کے تصدق، ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ تعلیم کا مقصد روٹی کمانا ہے، لیکن لڑکیوں کے متعلق ہم نے ابھی تک اتنا بھی طے نہیں کیا۔ ان کی عمر کا بہترین حصہ اس بے مقصد تعلیم کی نذر ہو جاتا ہے اور اس کے بعد نہ ان بچاریوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا مستقبل کیا ہے اور نہ ہی ان کے ماں باپ کی سمجھ میں آتا ہے کہ ان کے لئے کیا کیا جائے۔ لیکن تقلیدی ذہنیت دیکھئے کہ بڑی لڑکی کے متعلق وہ اس خلجان میں مبتلا ہوتے ہیں اور چھوٹی لڑکیوں کو اسی طرح سکولوں اور کالجوں میں بھیجتے چلے جاتے ہیں۔ وہ بھیجتے چلے جاتے

ہیں اور تعلیم کے ذمہ دار حضرات انھیں اسی طرح درسگاہوں سے نکالتے چلے جاتے ہیں۔ نہ وہ سوچتے ہیں کہ ہم انھیں کیوں پڑھا رہے ہیں اور نہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انھیں کیسا بنا رہے ہیں۔ سوچتے یہ نہیں اور مصیبت بیچاری بچیوں کی آجاتی ہے۔ ان کی ساری زندگی تلخ گذرتی ہے۔ نہ ہی وہ ہماری قدیم "جاہل" لڑکیوں کی طرح متاہل زندگی میں مکمل خودسپردگی (COMPLETE SURRENDER) کے لئے ذہنی طور پر تیار کی جاتی ہیں اور نہ ہی وہ زندگی کے کسی بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ ان حالات میں، ان کی تعلیم ان کے لئے مفید بننے کے بجائے، الٹا ان کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف، ہماری مجبوری یہ ہے کہ لڑکی کے رشتے کے لئے سلسلہ جنبانی کے وقت سب سے پہلے سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ لڑکی کی تعلیم کس قدر ہے ـــــ غرض دوگونہ عذاب است جان مجنوں را ـــــ غلط بنیادوں پر اٹھے ہوئے معاشرہ میں ایک ایسا خبیث چکر (VICIOUS CIRCLE) وجود میں آجاتا ہے جس سے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔

ان تمام خرابیوں کا حل اس کے سوا کوئی نہیں کہ ہم اپنے نظام تعلیم کو بدلیں۔ پہلے یہ طے کریں کہ تعلیم سے مقصد کیا ہے۔ ہم نے اپنے بچوں (لڑکوں اور لڑکیوں) کو بنانا کیا ہے۔ پھر اس مقصد کے مطابق انھیں تعلیم دیں۔

تعلیم سے بنیادی مقصد، انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اور ان کے استعمال کے لئے فکر و نظر کی اصلاح ہے اور یہ مقصد کسی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتا جب تک ہم اپنے تعلیمی نظام کو قرآنی خطوط پر استوار نہ کریں۔ اسی سے وہ مقصد بھی حاصل ہو سکے گا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی مرد کے دل سے، اس کی برتری اور تغلب اور عورت کی فروتری اور محکومی کا خناس نکالنا۔ قرآن مرد اور عورت، دونوں میں مساوات کی تعلیم دے کر ایک دوسرے کا صحیح احترام پیدا کرتا ہے۔ اور یہی چیز ازدواجی زندگی، بلکہ پورے معاشرہ کو جنت بداماں بنا سکتی ہے۔ مشرق ہو یا مغرب، جب تک دونوں اصناف (مرد اور عورت) تغلب کا احساس دل سے نکال کر، مساوات اور تکریم باہمی کا جذبہ پیدا نہ کریں گے، انسان کی زندگی سکون آشنا نہیں ہو سکے گی۔

(۵) لیکن سوال یہ ہے کہ جب تک ہمارے نظام تعلیم میں اس قسم کی تبدیلی اور مرد کی ذہنیت میں اس قسم کا قرآنی انقلاب نہ آجائے، لڑکیوں کی مشکلات کا حل کیا ہے؟ ان کی مشکلات کا اطمینان بخش حل تو کوئی نہیں ہو سکتا البتہ ان کی شدت میں کسی حد تک کمی پیدا کی جا سکتی ہے۔ جن بچیوں میں صرف (HOUS WIFE) بننے کی صلاحیت ہو (اور اکثریت ایسی ہی بچیوں کی ہوگی) انھیں متاہل زندگی کے لئے ذہنی طور پر تیار کیا جائے۔ یعنی انھیں ان کی خیالی دنیا کی موہوم جنت میں رکھنے کے بجائے حقائق (FACTS) کا سامنا کرنے کے قابل بنا دیا جائے۔ یعنی انھیں بتایا جائے کہ موجودہ ماحول میں انھیں بحیثیت بیوی، اپنے خاوند اور اس کے عزیزوں سے نباہ کرنے کے لئے کس قدر قربانی دینی پڑے گی۔ جن (نادر صلاحیتوں کی) بچیوں میں، تمہارے الفاظ میں، اس امر کی صلاحیت ہو کہ وہ ہزاروں بچوں کو

انسان بنا سکیں یا سینکڑوں گھرانوں کا دکھ درد مٹا سکیں انھیں ان بلند مقاصد کی سرانجام دہی کے مواقع بہم پہنچانے چاہئیں اور ہمیں مل کر اس کی انتہائی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ ہمارے موجودہ غلط معاشرہ کے پیدا کردہ بدطینت عناصر سے محفوظ رہیں۔ یہ اُن کا فریضہ نہیں ہمارا فریضہ ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان سب کو اپنی بیٹیاں سمجھیں اور اسی طرح ان کی دیکھ بھال کریں جس طرح اپنی لڑکیوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک پاکیزہ سیرت عورت اپنی حفاظت آپ کرنے کی بڑی قوت اپنے اندر رکھتی ہے لیکن غلط معاشرہ میں ایسے عناصر ہوتے ہیں جو یہ سمجھ کر کہ عورت کمزور ہوتی ہے، اس پر دلیری سے ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔ اپنے معاشرے کی بچیوں کی ایسے عناصر سے حفاظت، ہمارا مشترکہ فریضہ ہونا چاہیئے۔

مجھے تم سے حرفاً حرفاً اتفاق ہے کہ (صالح مرد کی طرح) عورت بھی ضبط خویش پر پوری پوری قدرت رکھتی ہے۔ (خود قرآن اس پر شاہد ہے) اور جنسی تحریک کوئی ہوا نہیں جس سے ڈرا اور سہما جائے۔ نہ ہی اس قسم کے ضبط سے کسی بیماری کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اس سے تو بلکہ توانائیوں اور صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے اس کے لئے پاکیزہ خیالات بنیادی شرط ہے جنسی جذبہ کا اتنا تعلق طبعی ہیجان (Physical Impulse) سے نہیں جتنا نفسیاتی تحریک (PSYCHOLOGICAL URGE) سے ہے اور نفسیات کا سرچشمہ خیالات ہیں۔ پاکیزہ خیالات، قرآن کی مستقل اقدار کو سامنے رکھنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ پاکیزہ خیال، بلند سیرت عورت کی پیشانی پر ایسا نور عصمت جگمگاتا ہے جس سے ہزار ملوبطروں کا حسن صورت شرمندہ ہوتا ہے۔

(۶) جو لڑکیاں معاشی طور پر آزاد ہوتی ہیں (یعنی جو خود کمانے کے قابل ہوتی ہیں) ان کی ازدواجی زندگی کس طرح گذرتی ہے، اس کے متعلق میں کچھ تفصیل سے کہنا چاہتا تھا۔ لیکن (جیسا کہ تم نے لکھا ہے) اس کے متعلق اگر کوئی "طاہرہ بیٹی" اپنا تجربہ بیان کرے تو وہ زیادہ بہتر ہوگا۔ سردست میں اس قدر بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو واقعات میرے علم میں آئے ہیں، وہ یہی بتاتے ہیں کہ موجودہ غلط ماحول میں ان کی ازدواجی زندگی بھی کامیاب نہیں ہوتی۔ بلکہ اور تلخ ہو جاتی ہے۔

(۷) اس میں شبہ نہیں کہ عورت کا مسئلہ جس قدر اہم ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ لیکن یہ مشکل ہماری اپنی پیدا کردہ ہے۔ اگر ہم قرآن کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل دریافت کرنا چاہیں تو اس میں کوئی مشکل ہی باقی نہیں رہتی۔ لیکن مردوں کا ایغو (ہوس اقتدار) انھیں اس طرف آنے نہیں دیتا۔ اس کے لئے انھوں نے طرح طرح کے "مقدس بہانے" تراش رکھے ہیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ جن گھرانوں کے مردوں اور عورتوں نے قرآنی فکر کو اپنایا ہے، ان کے ہاں یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔ وہاں ایک دوسرے پر تغلب کی بجائے باہمی تکریم کا جذبہ بیدار ہو گیا ہے اور گھر جنت کا گہوارہ بن گیا ہے۔ لیکن یہ گھرانے ابھی خال خال ہیں۔ ہمارا عام معاشرہ (مشرق اور مغرب، دونوں میں) بدستور جہنم بنا ہوا

ہے۔ اس سے نجات کی صورت قرآنی اقدار کے تمکن کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ جب معاشرہ قرآنی خطوط پر متشکل ہو جائے تو اس وقت نہ، متاہل زندگی عورت کے لئے بلند مقاصد انسانیت کے حصول کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہے اور نہ ہی (عندالضرورت) تجرد کی زندگی کسی قسم کی دشواری یا خطرہ کا موجب بنتی ہے۔ اگر ہمارے ہاں کی بچیاں اس کے لئے کوشش کریں تو اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کی رفتار بہت تیز ہو سکتی ہے، اس لئے کہ معاشرہ کے سنوارنے میں عورت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم ان کے راستے کی دشواریوں کے دور کرنے میں ان کی پوری مدد کریں۔ باقی سب کچھ وہ خود کر لیں گی۔ جب عورت کسی کام کے لئے مستعد ہو جائے تو اس میں بے پناہ قوت آ جاتی ہے۔

(۸) آخر میں اسے دُہرا دینا چاہتا ہوں کہ عورت کے لئے فطرت کے پروگرام کے مطابق بالعموم وہی زندگی ہو سکتی ہے جس میں وہ اپنی نسائیت (Feminity) اور امومیت (MOTHERLINESS) کی نشو و نما کرتے ہوئے، تعمیر انسانیت اور تحسین معاشرت کے امور میں برابر کا حصہ لے۔ اور یہ چیز قرآنی معاشرہ ہی میں میسر آ سکتی ہے۔ لیکن بہ حالاتِ موجودہ، جبکہ ان میں سے ایک ہی چیز حاصل ہو سکتی ہو اور دونوں کا جمع کیا جانا ممکن ہو، یہی کیا جا سکتا ہے کہ بجز ان بچیوں کے جن میں بلند مقاصد کے حصول کی صلاحیتیں ہوں، ہم اپنی لڑکیوں کو ازدواجی زندگی بسر کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار کریں اور لڑکوں کو حق المقدور ان کی عزت کرنا سکھائیں۔ اور بلند صلاحیتوں کی بچیوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کریں کہ فنی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کی بلند اقدار بھی اُن کے سامنے آتی جائیں اور وہ دل کے پورے اطمینان، سکون اور یکسوئی کے ساتھ انسانیت کے لئے منفعت بخش امور کی سرانجام دہی میں مصروف رہ سکیں اور سوسائٹی میں وہ انتہائی عزت و تکریم کی نگاہوں سے دیکھی جائیں۔ خود قرآنی معاشرہ میں بھی اس قسم کے استثنائی اور خصوصی حالات ہو سکتے ہیں جن میں (مرد ہو یا عورت) ازدواجی زندگی بسر کئے بغیر، اپنی صلاحیتوں کو تعمیر انسانیت کے بلند مقاصد کے لئے وقف کر دیں۔ اس سے ان کے شرفِ انسانیت میں فرق نہیں آ جائے گا۔

(۹) طاہرہ بیٹی! میں ایک بار پھر تمہیں، تمہارے قلب و دماغ کی قابلِ رشک صلاحیتوں پر مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ تمہیں ایسے مواقع میسر آ جائیں کہ تم ان صلاحیتوں کو تعمیر انسانیت کے بلند مقصد کے لئے صرف کر سکو۔

ہزاروں دعاؤں کے ساتھ

تمہارا "باباجی"

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

ملک میں ایک ایسے ادارہ کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی جس کے پیش نظر محض تجارت نہ ہو بلکہ اس کا اولین مقصد یہ ہو کہ اعلیٰ ترین لٹریچر شائع کر کے، ملک کی علمی، ذہنی اور قلبی سطح کو بلند کیا جائے۔ الحمد للہ کہ "میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ" کے نام سے ایسا ادارہ قائم ہو گیا ہے جسے ملک کے نامور اہل قلم حضرات کا تعاون حاصل ہے اور انتظامی امور تجربہ کار اور دیانتدار ہاتھوں میں محفوظ ہیں۔ (دوسرے لٹریچر کے علاوہ)

ادارہ طلوع اسلام

کا تمام لٹریچر میزان پبلیکیشنز سے مل سکے گا۔ ادارہ طلوع اسلام کے لٹریچر کے لئے اب آپ نہ ادارہ کو لکھئے اور نہ ہی

مکتبہ طلوع اسلام

کو بلکہ صرف

میزان پبلیکیشنز (لمیٹڈ)

۲۷-بی - شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

کو لکھئے۔ (البتہ رسالہ طلوع اسلام کے سلسلہ میں بدستور ادارہ طلوع اسلام سے خط و کتابت کیجئے)

۲- آپ کو (انگریزی - اردو - عربی - فارسی) کی جس کتاب کی ضرورت ہو، اس کیلئے ہمیں لکھئے۔ آپ کو اصل قیمت (اور محصول ڈاک) پر کتاب مہیا کر دی جائے گی۔ اگر آپ مستقل خریدار ہیں تو آپ کو محصول ڈاک بھی ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس کی تفصیل کے لئے کارڈ لکھئے۔ مکمل فہرست کتب ایک کارڈ لکھ کر منگا لیجئے۔

(چوہدری) عبدالرحمٰن منیجنگ ڈائرکٹر میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

وحدتِ ملّت

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ کالونی لاہور

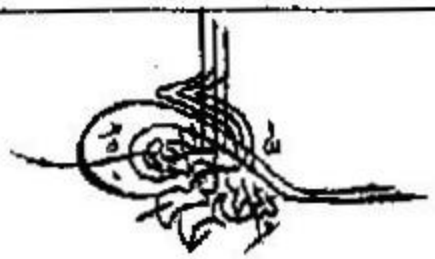

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وحدتِ ملّت

(پرویز صاحب کی حیدرآباد کی تقریر پر مبنی مقالہ)

یوں دیکھئے تو ساری دنیا میں انسان بستے ہیں جو (سب کے سب) ایک ہی نوع کے افراد ہیں لیکن ان کے اختلافات پر نگاہ ڈالئے تو ایسا دکھائی دے گا گویا دنیا کی آبادی مختلف قسم کی مخلوقات کا مجموعہ ہے جن میں سوائے شکل و صورت کے اور کوئی بات بھی مشترک نہیں کہیں ان میں خاندانوں کا اختلاف ہے، اور ہر خاندان دوسرے خاندان کا دشمن ہے کہیں ذاتوں اور برادریوں کا اختلاف ہے، اور ہر برادری دوسری برادری سے بیر رکھتی ہے کہیں قوموں کا اختلاف ہے، اور ہر قوم دوسری قوم کو نگلنے کی فکر میں دکھائی دیتی ہے۔ ایک ہی قوم کے اندر

نوعِ انسان کے اختلافات

سیاسی پارٹیوں کا اختلاف ہے اور ایک پارٹی دوسری پارٹی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہے۔ ان تمام اختلافات سے اوپر چلئے، تو مذہب کا اختلاف ہے اور ایک مذہب دوسرے مذہب کو مٹانا فریضۂ خداوندی سمجھتا ہے۔ پھر مذاہب کے اندر فرقوں کا اختلاف ہے، اور ہر فرقہ دوسرے فرقے کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے۔ غرضیکہ انسان کی نوع تو ایک ہے لیکن باہمی اختلافات سے اس طرح بٹی ہوئی ہے کہ ان میں کوئی شے (بجز باہمی عداوت) بطور قدرِ مشترک دکھائی نہیں دیتی۔

قرآن کریم نے اس طرح اختلافات سے بٹے ہوئے انسانوں کو مخاطب کیا اور ان سے کہا کہ تمہیں اس کا علم و احساس بھی ہے کہ

خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ۔ ([illegible])

خدا نے تم سب کو ایک جرثومۂ حیات سے پیدا کیا ہے:

پیدائش کے اعتبار سے تم سب کی اصل ایک ہے۔ تم سب ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی شاخ کے پتے ہو۔

وحدتِ انسانیت

کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ ایک درخت کی ایک شاخ، دوسری شاخ کی تباہی کی فکر میں رہتی ہو، اور ایک پتہ دوسرے پتے کی گھات میں بیٹھا ہو کہ وہ کب غافل ہو اور میں اسے نگل جاؤں؟ درخت سرسبز و شاداب ہوتا ہے تو اس کی ہر شاخ اور ہر پتے میں زندگی اور تازگی کی نمود ہوتی ہے اگر وہ خشک ہوتا ہے تو اس کی ہر ٹہنی مرجھا جاتی ہے۔ یاد رکھو

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۳۱/۲۸)

تم سب کا پیدا کرنا اور دوبارہ اٹھانا، ایک نفس (کی پیدائش اور بعث) کی طرح ہے۔

اس نے کہا کہ شروع میں تمام نوعِ انسان ایک برادری تھی لیکن اس کے بعد لوگوں نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹)

اور تمام نوعِ انسان ایک امت (برادری) تھی۔ پھر انہوں نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے۔

اور اس طرح مختلف خاندانوں، قبیلوں، نسلوں، گروہوں، قوموں اور مذہبوں میں بٹ گئے۔ جب ان میں اس طرح اختلافات شروع ہو گئے اور ایک گروہ، دوسرے گروہ کا دشمن ہو گیا تو خدا نے اپنی طرف سے حضرات انبیاءؑ کرام کو بھیجنا شروع کیا تاکہ وہ ان کے اختلافات مٹا کر پھر سے انہیں ایک عالمگیر برادری بنا دیں۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۔ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۔ ..... (۲/۲۱۳)

تمام انسان ایک ہی برادری تھے۔ (پھر انھوں نے باہمی اختلافات سے تفرقہ شروع کر دیا تو) اللہ نے انبیاء کرام کو بھیجا جو انہیں (باہمی اتحاد اور یگانگت کی زندگی کے خوش گوار نتائج کی) خوش خبری دیتے تھے اور (اختلاف و افتراق کے تباہ کن عواقب سے) آگاہ کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ اللہ نے ضابطہ قوانین بھی بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کریں۔

ان تمام انبیاء کرامؑ کا پیغام ایک ہی تھا یعنی وحدتِ انسانیت۔ یہی پیغام حضرت نوحؑ کا تھا، یہی حضرت ابراہیمؑ کا۔ یہی حضرت موسیٰؑ نے کہا تھا، یہی حضرت عیسیٰؑ نے۔ اور آخر الامر یہی پیغام نبی اکرمؐ نے نوعِ انسان تک پہنچایا تھا

انبیاء کرام کی دعوت

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ ۔ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ إِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى أَنْ أَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۔ كَبُرَ

عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ .... (۴۲/۱۳)

(اے رسول) اللہ نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔ اور وہی جو ہم نے تمہاری طرف وحی کی ہے۔ اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا۔ (وہ حکم یہ تھا کہ) خدا کے مقرر کردہ نظامِ زندگی (الدین) کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ مت ڈالو۔

(یہی دعوت تمہاری ہے) لیکن جس بات کی طرف تو انہیں بلاتا ہے مشرکین پر وہ بات بڑی گراں گزرتی ہے۔

یہاں اس بات کو ذرا غور سے سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ انسانوں کے اختلافات مٹا کر ان میں وحدت پیدا کرنے کی دعوت، مشرکین پر بڑی گراں گزرے گی۔ اس نکتہ کی وضاحت ذرا آگے چل کر کی جائے گی۔

چونکہ ان انبیاء کرام کا پیغام ایک تھا اس لئے یہ سب کے سب ایک ہی برادری کے افراد تھے یہی وہ جماعت تھی جس کے متعلق نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۲۱/۹۳)

یہ تمہاری جماعت، ایک ہی برادری ہے۔ اور میں تم سب کا رب ہوں، سو تم نے میری محکومیت اختیار کرنا۔

جو لوگ حضرات انبیاء کرام کی اس دعوت پر ایمان لا کر، باہمی تفرقے مٹا دیتے تھے اور اس طرح ایک خدا کی محکومیت اختیار کر کے، ایک برادری بن جاتے تھے، وہ ایک اُمت قرار پاتے تھے۔ جو اس دعوت سے انکار کر کے، اپنے اپنے اختلافات پر قائم رہتے تھے، وہ دوسرا فریق بن جاتے تھے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

دو جماعتیں

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲)

اللہ وہ ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا، پھر تم سے کچھ لوگ نہ ماننے والے (کافر) بن گئے اور کچھ ماننے والے (مومن) ہو گئے۔

جو لوگ اس دعوت پر ایمان لا کر اپنے اختلافات مٹا دیتے تھے، ان میں پھر باہمی تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جماعتِ مومنین کے اندر، تفرقہ کتنا سنگین جرم ہے۔ اس کا اندازہ بنی اسرائیل کے اس واقعہ سے لگائیے جسے قرآن کریم نے سورہ طٰہٰ میں بیان کیا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ حضرت موسیٰؑ کچھ دنوں کے لئے کوہِ طور پر تشریف لے گئے اور اپنی جگہ حضرت ہارونؑ کو بنی اسرائیل کا نگران بنا کر چھوڑ گئے۔ یاد رہے کہ حضرت ہارونؑ بھی حضرت موسیٰؑ کی طرح خدا کے رسول تھے۔

تفرقہ سنگین جرم ہے

بنی اسرائیل اپنی جہالت سے سامری کے فریب میں آ گئے اور انہوں نے گوسالہ (بچھڑے) کی پرستش شروع کر دی۔ حضرت ہارونؑ نے انہیں نرمی سے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش

سے باز نہ آئے۔ جب حضرت موسیٰؑ واپس آئے تو وہ قوم کی اس حالت کو دیکھ کر سخت برافروختہ ہوئے۔ انھوں نے حضرت ہارونؑ سے کہا کہ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا أَلَّا تَتَّبِعَنِ (۲۰/۹۲) جب تم نے دیکھا تھا کہ یہ لوگ اس طرح گمراہ ہو رہے ہیں، تو وہ کون سی بات تھی جس نے تمہیں ان سے روکا کہ جس طرح میں ان پر سختی کیا کرتا ہوں، تم بھی اسی طرح کرو؟

آپ نے سوال سن لیا۔ اب اس کا جواب سنئے۔ اسے پھر سمجھئے کہ یہ جواب ایک نبی کی طرف سے دیا جا رہا ہے اور دوسرا نبی اس جواب کو سن رہا ہے۔ جواب یہ تھا کہ

إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي (۲۰/۹۴)

میں اس سے ڈر گیا کہ تم کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا اور میری بات یاد نہ رکھی۔

اس جواب سے حضرت موسیٰؑ مطمئن ہو گئے یعنی انھوں نے بھی اس سے اتفاق کیا کہ حضرت ہارونؑ نے اچھا کیا کہ تھوڑے سے وقت کے لئے قوم کی جہالت کو گوارا کر لیا اور انہیں تفرقہ سے بچا لیا یعنی قوم میں تفرقہ ایسا شدید جرم ہے کہ اس سے بچنے کے لئے کچھ وقت کے لئے شرک جیسی جہالت کو بھی برداشت کیا جا سکتا ہے۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ حضرت ہارونؑ نے بنی اسرائیل کی اس جہالت کو صرف حضرت موسیٰؑ کی واپسی تک (عارضی طور پر) گوارا کر لیا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ (معاذ اللہ) مستقل طور پر حق کو چھوڑ کر باطل پرستی پر راضی ہو گئے تھے تاکہ قوم میں اتحاد قائم رہے۔ حق کو چھوڑ کر اتحاد پیدا کرنا، جائز قرار نہیں پا سکتا۔ حضرت ہارونؑ نے بنی اسرائیل کو ان کی جہالت پر روکا تھا۔ البتہ سختی نہیں کی تھی۔ ان سے، حضرت موسیٰؑ کی واپسی تک نرمی برتی تھی۔

بہرحال، قرآن کریم کے اس بیان سے واضح ہے کہ اس کی نگاہ میں تفرقہ کس قدر سنگین جرم ہے۔

قرآن کریم ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ایک نبی آتا اور اپنے متبعین کے اختلافات مٹا کر انہیں امت واحدہ بنا جاتا، لیکن اس کے چلے جانے کے بعد، وہ لوگ آپس میں تفرقہ پیدا کر لیتے۔ وہ کیوں ایسا کرتے؟ اس کا جواب اس نے

نبی کے بعد اختلافات

ایک لفظ میں دیا ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۴۲/۱۴)۔ خدا کی طرف سے وحی آجانے کے بعد، وہ باہمی ضد کی بنا پر آپس میں تفرقہ پیدا کر لیتے یعنی یہ بات نہیں تھی کہ ان کی نگاہوں سے حقیقت گم ہو جاتی۔ یا وہ وحدتِ امت اور باہمی اخوت و الفت کی برکات کے قائل نہ رہتے اس لئے تفرقہ پیدا کر لیتے۔ بالکل نہیں۔ وہ ان تمام باتوں کو اچھی طرح جانتے لیکن محض ایک دوسرے کی ضد سے، ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے جذبہ کے ماتحت، دوسروں سے بڑا بننے کے خیال سے، باہمی تفرقہ پیدا کر لیتے۔

اس طرح اُمت مختلف فرقوں میں بٹ، جاتی اور ان کے مذہبی پیشوا یا سیاسی لیڈر، ایک دوسرے کی ضد سے، فرقہ بندی کی گرہوں کو مضبوط کرتے رہتے۔ اسی میں ان کی "چودھراہٹ" کا راز تھا۔ اس سے وہ بڑے بنتے تھے۔

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا یہاں تک کہ نبی اکرمؐ تشریف لائے۔ آپ کی بعثت کا مقصد بھی یہی تھا کہ نوعِ انسان کے ان اختلافات کو مٹا کر، انہیں امتِ واحدہ بنا دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالےٰ کی طرف سے آپ کو قرآن کریم ملا جو ان تمام امور کو کھول کھول کر بیان کرتا تھا جن میں لوگ اختلاف کرتے تھے۔

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۶/۶۴)

اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو ان کے سامنے وہ باتیں کھول کر بیان کر دے جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں جو لوگ (اس طرح اپنے اختلافات مٹا کر) اس کتاب پر ایمان لے آئیں گے یہ ان کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرے گی اور ان کے لئے موجبِ رحمت بنے گی۔

اُمتِ مسلمہ

چنانچہ اس طرح نبی اکرمؐ نے ایک اُمت تیار کی جس میں کوئی باہمی اختلاف نہیں تھا۔ ان کا ضابطہ حیات (قرآن کریم) ایک تھا۔ ان کا نظامِ زندگی ایک تھا۔ ان کا نصب العین ایک تھا۔ ان کا راستہ ایک تھا۔ منزل ایک تھی۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳)۔ اور اس طرح ہم نے تمہیں ایسی اُمت بنا دیا جو تمام افرادِ انسانیہ سے یکساں فاصلہ پر ہے (یعنی اس کے نزدیک تمام انسان ایک جیسے ہیں)۔ اس اُمت کا فریضہ ہے کہ یہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگران رہے۔ اور ان کے اعمال کا نگران ان کا رسول ہو۔

یہ اُمت بنائی اور اس سے تاکیداً کہہ دیا کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا۔ تم سب نے خدا کے اس ضابطہ حیات (قرآن کریم) کو مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ اس سے تمہاری وحدت قائم رہے گی۔ وَلَا تَفَرَّقُوْا۔ اور دیکھنا! آپس میں تفرقہ پیدا نہ کر لینا۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً۔ تم اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ۔ اس نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی اُلفت ڈال دی۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔ اور اس طرح اس نے اپنے فضل و عنایات سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ۔ تم تباہی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ سو اس نے تمہیں، اس میں گرتے گرتے بچا لیا۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۳/۱۰۳)

اس طرح اللہ اپنے احکام و دلائل تم سے واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم سیدھے راستے پر چلتے رہو۔

قرآن کریم کی یہ آیات جلیلہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ ان میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت لوگوں کی حالت یہ تھی کہ وہ باہمی اختلافات اور تفرقہ سے تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ وہ اس میں گر ہی چاہتے تھے کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں بچا لیا۔ قرآنی تعلیم کے ذریعے، ان کے دلوں سے عداوت کی آگ نکال کر اس کی جگہ ایک دوسرے کی الفت کی ٹھنڈک پیدا کر دی اور اس طرح انہیں ایک ایسی اُمت بنا دیا جس میں کوئی اختلاف اور کسی قسم کا تفرقہ نہ تھا۔ یہ سب مسلمان تھے۔ ان میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ یہ سب بھائی بھائی تھے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے نفرت، بغض، حسد اور عداوت نہیں تھی۔ ان کا نظام ایک تھا، اس میں الگ الگ پارٹیاں نہیں تھیں۔

وحدت کی تاکید

ان سے کہہ دیا کہ دیکھو! اب تم میں کوئی تفرقہ نہیں رہا۔ خدا کی کتاب تمہارے پاس ہے۔ یہ اختلافات کو مٹانے کے لئے آئی ہے۔ اس لئے وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳/۱۰۵)۔ اب تم نہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاتا جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح تعلیم آ جانے کے بعد فرقے پیدا کر لئے اور باہمی اختلاف کرنے لگ گئے یہی لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے۔

ان سے اس سے بھی زیادہ تاکید سے کہا گیا کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ دیکھنا! تم نے (خدائے واحد پر ایمان لانے کے بعد) پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ کوئی شخص خدائے واحد پر ایمان لانے کے بعد مشرک کس طرح سے ہو سکتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ اس میں حیرت کی کون سی بات ہے وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ (۱۲/۱۰۶)۔ لوگوں میں اکثر ہوتے ہیں کہ وہ اللہ پر ایمان کے مدعی بھی ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ مشرک بھی ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری سمجھ میں یہ بات اس لئے نہیں آتی کہ تم سمجھتے ہو کہ مشرک وہی ہوتے ہیں جو بتوں کو پوجتے ہیں لیکن شرک اتنا ہی نہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ اور یہ وہ شرک ہے جس میں ایمان کے مدعی بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ شرک کیا ہے؟ غور سے سنئے۔ ارشاد ہے۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ دیکھنا تم نے کہیں مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا یعنی ان لوگوں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر رہ گئے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۲)۔ فرقہ بندی سے انسانوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر گروہ اپنے اپنے مسلک پر اترا تا ہے۔ ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور باقی سب باطل پر

فرقہ بندی شرک ہے

ہیں، میں جنتی ہوں، باقی سب جہنمی ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی رُو سے دین میں اختلاف پیدا کرنا اور فرقے بنانا کس قدر سنگین جرم ہے؟ آپ نے شروع میں دیکھا تھا کہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ آپ جو اتحاد اور اتفاق، وحدت اور یگانگت کی دعوت دیتے ہیں۔ تو كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ (۴۲/۱۳) یہ بات مشرکین پر بڑی گراں گزرتی ہے اب آپ نے دیکھ لیا کہ یہ مشرکین کون ہیں جن پر وحدت اُمت کی دعوت گراں گزرتی ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جو دین میں تفرقہ پیدا کریں اور فرقہ بندیاں اور گروہ سازیاں شروع کر دیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق نبی اکرمؐ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۶۰)

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور خود ایک گروہ بن گئے، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

کس قدر واضح الفاظ ہیں قرآن کریم کے یہ ارشادات کہ جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کریں۔

(i) وہ توحید پرست نہیں۔ مشرک ہیں۔ اور

(ii) خدا کے رسول کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

یعنی ان سے نہ خدا کا کوئی تعلق ہے، نہ خدا کے رسول کا کوئی واسطہ!

رسول اللہ کی زندگی میں ایک مرتبہ منافقین نے امت میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے لئے انھوں نے ایک مسجد بنائی۔ سُنئے کہ اللہ تعالےٰ نے اُس مسجد کے متعلق کیا ارشاد فرمایا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا۔ وہ لوگ جنھوں نے اس غرض سے مسجد بنائی ہے کہ اس سے (اسلام کو) مضرت پہنچائی جائے۔ اور کفر کی راہ اختیار کی جائے۔

یہ کفر کی راہ، اور اسلام کے لئے ضرر کا موجب کیا چیز تھی؟ وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ۔

مسجد ضرار انھوں نے یہ مسجد اس لئے بنائی ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر دیا جائے۔ یہ ہے کفر کی راہ۔ یہ ہے وہ خطرہ جس سے اسلام کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یہ مسجد نہیں۔ إِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِن قَبْلُ۔ یہ اس شخص کے لئے کمین گاہ ہے جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول کے لئے جنگ کرتا رہا ہے کہ وہ اس (کارِ خیر) کی اوٹ میں بیٹھ کر اسلام کے قلعے پر گولہ باری کرے۔ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ۔ یہ لوگ قسمیں کھائیں گے کہ ہمارے ارادے بڑے نیک ہیں۔ ہم یہ سب کچھ کارِ خیر سمجھ کر کر رہے ہیں۔ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ۔

اللہ اس کی بشارت دیتا ہے کہ یہ لوگ پکے جھوٹے ہیں۔ لہٰذا اے رسول! لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا (۹/۱۰۸) تم نے ہرگز ہرگز اس مسجد میں قدم نہ رکھنا۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رُو سے امت میں تفرقہ پیدا کرنا کتنا بڑا جرم ہے؟ اتنا بڑا جرم کہ اگر کوئی مسجد بھی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب بنے تو اس مسجد میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ وہ مسجد نہیں، ایسی کمیں گاہ ہے جس میں بیٹھ کر دشمنانِ دین حصارِ ملت پر گولہ باری کرتے ہیں۔

ایک طرف اس امت کو تفرقہ اور اختلافات سے بچنے کی اس قدر سخت تاکیدات کیں اور دوسری طرف یہ حقیقت ان کے دل پر اچھی طرح منقوش کر دی کہ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (۴۹/۱۰)۔ یاد رکھو! سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ ۔ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ ۔ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹)

محمدؐ اللہ کا رسول۔ اور جو لوگ اس کے ساتھی ہیں۔ وہ کفار کے مقابلہ میں (چٹان کی طرح) سخت ہیں۔ اور آپس میں نہایت نرم دل اور مرحمت کوش۔

ان کے باہمی اتفاق، یک جہتی، اور باہم پیوستگی کا یہ عالم ہے کَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (۶۱/۴)، گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

یہ تھی وہ اُمت جسے قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا۔ اس امت کے افراد میں کوئی اختلاف نہیں تھا کسی قسم کا تفرقہ نہیں تھا۔ کوئی فرقہ نہیں تھا۔ کوئی الگ الگ پارٹیاں نہیں تھیں حضورؐ کو ان کی وحدت اور باہمد گر محبت اور الفت کا اس قدر خیال تھا کہ آپ نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ:-

حجۃ الوداع کا خطبہ

اے لوگو! یقیناً تمہارا رب ایک ہے۔ اور تمہارا باپ ایک ہے۔ (یعنی تم سب اصل کے اعتبار سے ایک ہو) عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر۔ سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں بجز تقویٰ کے۔

یاد رکھو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔

تمہارا خون اور تمہارا مال قیامت تک اس طرح (ایک دوسرے پر) حرام ہے جس طرح یہ دن، اس مہینے میں اور اس شہر میں حرام (واجب الاحترام) ہے۔

پھر فرمایا:-

میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں۔ اگر تم نے اسے مضبوط پکڑ لیا تو تم گمراہ نہیں ہو گے

وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ! (صحاح۔ بحوالہ سیرۃ النبی۔ علامہ شبلی۔ جلد دوم صفحہ ۱۵۱ - ۱۵۲)

مسلمانوں کے خون کے واجب الاحترام ہونے کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ :-

وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا (۴/۹۳)

اور جو مسلمان کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا۔ اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی۔ اور اس کے لئے خدا نے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ان تاکیدی احکام کے ساتھ نبی اکرمؐ نے اس اُمتِ واحدہ کو اپنے پیچھے چھوڑا۔ پھر اس اُمت سے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ تم نے یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ یہ وحدت اور اتحاد، حضرت نبی اکرمؐ کی زندگی تک ہے۔ حضورؐ کے بعد اس میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ہو سکتا ہے اور یہ اُمت فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ سکتی ہے۔ ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ۔ محمدؐ بجز اس نسبت کہ اللہ کے رسول ہیں۔ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گذرے ہیں۔ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ۔ سو اگر یہ (کل کو) وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں، تو کیا تم یہ سمجھ کر کہ یہ سارا نظام اور اُمت کی وحدت آپؐ کی زندگی تک تھی، پھر سے اُسی روشِ کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے (اور فرقوں اور گروہوں میں بٹ جاؤ گے؟) وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا (۳/۱۴۴)۔ اور جو کوئی اُس روشِ کہن کی طرف پلٹ جائے گا تو وہ اس سے اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ (کچھ اپنا ہی نقصان کرے گا)۔

(۰)

یہ تھی وہ اُمتِ واحدہ جسے نبی اکرمؐ نے چھوڑا۔ اس کے بعد تاریخ کے اوراق کو چودہ سو سال آگے کی طرف اُلٹیے

ہماری حالت

اور دیکھئے کہ آج اسی اُمتِ واحدہ کی کیا صورت ہے۔ تعداد کے اعتبار سے دیکھئے تو آسمان کے تاروں کی طرح ان گنت۔ (کم از کم پچاس۔ ساٹھ کروڑ کا تو عام اندازہ ہے) جغرافیائی پوزیشن کے اعتبار سے دیکھئے تو کرۂ ارض کے بیچوں بیچ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر لیکن اختلافات کو دیکھئے تو انسان محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ کیا یہ وہی اُمت ہے جس کی وحدت کے متعلق قرآن کریم نے اتنے تاکیدی احکام دیئے تھے۔ کہیں نسلوں کا اختلاف ہے ___ یہ مغل، وہ پٹھان، یہ ترک وہ عرب ___ کہیں قومیتوں کا اختلاف ہے ___ یہ مصری وہ ایرانی۔ یہ عراقی وہ حجازی۔ یہ ہندی وہ چینی ___ یہ تو رہے نسلی اور وطنی اختلافات۔ اس سے آگے بڑھئے تو ایک ہی ملک کے اندر ذاتوں اور برادریوں کے اختلاف ___ شیخ، مرزا، راجپوت، پٹھان، جاٹ، ارائیں ___ پھر صوبائی اختلافات ___ سندھی، پنجابی، سرحدی، بلوچی، بنگالی ___ ان سب اختلافات سے اوپر اور سب سے

لہ حاشیہ صفحہ ... پر دیکھئے

گہرا مذہبی فرقہ بندی کا اختلاف ـــــ یہ شیعہ وہ سُنّی ۔ یہ حنفی وہ وہابی ۔ یہ دیوبندی وہ بریلوی ۔ یہ اہلِ حدیث وہ اہلِ قرآن ـــــ ان کے علاوہ، سیاسی پارٹیوں کے ہنگامی اختلافات (جو غنیمت ہے کہ یہ پاکستان میں آج کل ختم کر دیئے گئے ہیں) ۔ جب انسان اُس امت کو دیکھتا ہے جسے نبی اکرمؐ نے چھوڑا تھا، اور اس کے بعد اس اُمت پر نظر ڈالتا ہے جو آج کل ہمارے سامنے ہے، تو وہ انگشت بدنداں رہ جاتا ہے ـــــ یقیناً آسمان کی آنکھ نے ایسا انقلاب کبھی نہیں دیکھا ہوگا ۔ یہ اختلافات کیسے رونما ہوئے اور اُمتِ واحدہ، اس قدر تاکیدات کے باوجود، اتنے ٹکڑوں میں کیسے بٹ گئی، یہ ایک جگر پاش داستان ہے جسے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس کے بعد کیا پھر سے وہی وحدت پیدا ہو سکتی ہے؟ اور اگر ہو سکتی ہے تو کس طرح؟

کیا یہ اختلاف مٹ سکتے ہیں؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے (یعنی اس سوال کا کہ یہ اختلافات مٹ کر اُمت پھر سے اُمتِ واحدہ بن سکتی ہے یا نہیں) تو اس کے جواب کے لئے قرآن کریم کی اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لایئے جس میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ

وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ (۱۶/۶۴)

اور ہم نے تیرے اوپر یہ کتاب نازل ہی اس لئے کی ہے کہ تو لوگوں پر ان باتوں کو واضح کر دے جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔

یعنی قرآن کریم کا دعوےٰ یہ ہے کہ وہ تمام نوعِ انسان کے اختلافات کو مٹانے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کے نزول کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اختلافی امور کو واضح کر کے دودھ اور پانی کو الگ الگ کر کے بتا دے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ہم قرآن کی موجودگی میں یہ کہیں کہ ہمارے اختلافات کے مٹنے کی کوئی شکل نہیں، تو اس سے یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) قرآن کا یہ دعوےٰ غلط ہے کہ وہ اختلافات مٹا سکتا ہے، اور یا یہ کہ قرآن کے اس دعوےٰ پر ہمارا ایمان نہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف فرقوں میں سے ہر ایک فرقہ کا دعوےٰ ہے کہ ان کا عقیدہ اور مسلک قرآن کریم کے مطابق ہے۔ اگر اس بات کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خود قرآن کریم میں (معاذ اللہ) اختلافی باتیں موجود ہیں، جبھی تو اس سے ہر فرقہ کو اس کے مسلک کی تائید مل جاتی ہے لیکن یہ چیز خود قرآن کریم کے دعوے کے خلاف ہے۔

ضرار

اس نے کہا ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مجھ میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا

(حاشیہ صفحہ ۴۲) اگرچہ پاکستان میں (ONE-UNIT) کے صوبائی تقسیم کو ختم کر دیا ہے لیکن دلوں کے اندر ابھی تک یہ صوبائی تفریق باقی ہے۔

فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں یہ بہت سے اختلافات پاتے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ

(۱) قرآن کریم میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس لئے اس سے مختلف فرقوں کو اپنے اپنے مسلک کی تائید میں سند نہیں مل سکتی۔

(۲) قرآن کریم دنیا کے اختلافات مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اس میں آج بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہمارے اختلافات مٹا دے۔

لیکن کس طرح؟

اس سے دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ یہ اختلافات مٹ کس طرح سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰) تم جس بات میں بھی اختلاف کرو، تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف سے ہونا چاہیئے یعنی ہر اختلافی معاملہ میں فیصلہ خدا سے لینا چاہیئے "خدا سے فیصلہ لینے" کے معنی یہ ہیں کہ اس کی کتاب سے فیصلہ لیا جائے۔ ہر اختلافی معاملہ میں قرآن کریم کو حکم مانا جائے۔ اسے ثالث تسلیم کیا جائے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کریم سے فیصلہ کس طرح لیا جائے؟ کیا اس طرح کہ جن دو فرقوں یا پارٹیوں میں اختلاف ہو، وہ اپنے اپنے طور پر قرآن کریم سے فیصلہ لے لیں؟ اس طرح تو اختلافات مٹ نہیں سکتے ہم آئے دن مختلف فرقوں کے مناظرہ کرنے والوں کو دیکھتے ہیں۔ دونوں فریق، قرآن کی آیات پیش کرتے ہیں، لیکن یہ اُسے کہتا ہے کہ تم نے قرآن کے غلط معنی کئے ہیں یا غلط مفہوم لیا ہے اور وہ اسے یہی الزام دیتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دن بھر مناظرہ ہوتا رہتا ہے اور شام کو اس کا خاتمہ اکثر جھگڑے اور فساد سے ہوتا ہے۔ ہزار برس سے یہ مناظرے ہو رہے ہیں لیکن ان سے کوئی فرقہ مٹ نہیں سکا۔ بلکہ ان میں اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم سے فیصلہ لینے کا یہ طریق صحیح نہیں۔ اختلافی امور میں فیصلہ لینے کے لئے کسی تیسری پارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی کو حکم یا ثالث کہتے ہیں۔ یہ وہ طریق تھا جسے نبی اکرمؐ کے زمانے میں خود اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا تھا۔ اس نے حضورؐ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۴/۶۵)

ایک سند اتھارٹی کی ضرورت

تیرے رب کی قسم ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اختلافی معاملہ میں تجھے اپنا ثالث (حاکم) نہ بنائیں۔ پھر تیرے فیصلہ

سے اپنے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں بلکہ اس کے سامنے (بطیب خاطر) سر تسلیم خم کر دیں۔

مومنین پر یہ شرط عائد کی، اور نبی اکرمؐ کو حکم دیا کہ جب یہ لوگ کسی اختلافی معاملہ میں فیصلہ کرانے کے لئے تیرے پاس آئیں تو فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ (۴/۱۰۵) "تو ان میں قرآن کریم کے مطابق فیصلہ کیا کر"۔

یہ تھا وہ عملی طریق جس سے اُمت میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا تھا لیکن یہاں یہ سوال سامنے آئے گا کہ یہ عملی طریق تو رسول اللہ کی زندگی میں کارفرما تھا۔ رسول اللہ کے بعد کون سا عملی طریق اختیار کیا جائے گا؟

اس سوال کا جواب قرآن کریم نے خود ہی دے دیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ .... (۳/۱۴۴)۔ کیا اگر کل کو (رسول اللہ) وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں، تو تم (یہ سمجھ کر کہ یہ سلسلہ صرف حضورؐ کی ذات تک محدود تھا) پھر اپنے پرانے طریقے کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہی عملی طریق جو رسول اللہ کی زندگی میں رائج تھا حضورؐ کے بعد بھی جاری رہنا تھا۔ اسلام کا نظام حضورؐ کی طبعی زندگی تک محدود نہیں تھا۔

حضورؐ کے بعد!

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ حضورؐ کے بعد، اس سلسلہ کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اس کا جواب بھی قرآن کریم نے خود ہی دے دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ نبی اکرمؐ کا فریضہ یہ تھا کہ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ (۷/۱۵۷)۔ "وہ لوگوں کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے"۔ یعنی جن امور کو قرآن نے صحیح ٹھہرایا ہے وہ ان کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور جنہیں اس نے غلط قرار دیا ہے وہ لوگوں کو ان سے روکتا ہے۔ رسول اللہ کے بعد یہی فریضہ اُمت کا قرار پاتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (۳/۱۱۰)۔ "تم بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے متشکل کیا گیا ہے۔ تم لوگوں کو معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو"۔ اسی اُمت کو خدا نے اپنی کتاب کا وارث قرار دیا ہے۔ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (۳۵/۳۲)۔ "پھر ہم نے اس کتاب کا وارث انہیں بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے اس مقصد کے لئے چن لیا تھا"۔ لہٰذا، رسول اللہ کے بعد، اُمت کا فریضہ قرار پاگیا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ لوگ اپنے اختلافی امور کے فیصلہ کے لئے ایک حکم (ثالث) کی طرف رجوع کیا کریں جو ان امور کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق کرے یعنی یہ اُمت باہمی مشورہ سے (۴۲/۳۸) ایسا نظام حکومت قائم کرے جس میں تمام اختلافی امور کے فیصلے قرآن کے مطابق ہوتے رہیں چنانچہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا جو فریضہ سب سے پہلے رسولؐ کا اور حضورؐ کے بعد اُمت کا قرار دیا گیا ہے، وہی فریضہ اسلامی حکومت کا قرار دیا گیا ہے سورہ حج میں ہے:

قرآنی نظام حکومت

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ .... (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین میں تمکن عطا کریں گے تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور نہی سے روکیں گے۔

نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد امت نے، باہمی مشورہ سے، اسی قسم کی حکومت قائم کی تھی، جسے خلافت علیٰ منہاج نبوۃ کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کرنے میں جو فرائض اپنی زندگی میں رسول اللہؐ سرانجام دیتے تھے حضورؐ کی وفات کے بعد وہی فرائض "رسولؐ کا جانشین" (خلیفۃ الرسولؐ) سرانجام دیتا تھا یعنی اسلامی حکومت (خلافت علیٰ منہاج رسالت) لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے قرآن کریم کے مطابق کرتی تھی۔

جانشینانِ رسولؐ

جب اُمت نے اس عملی طریق کو چھوڑ دیا تو اس میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ اب ان اختلافات کو مٹانے کا طریق یہ ہے کہ پھر سے اسی قسم کی حکومت قائم کی جائے یعنی ایسی حکومت جو قرآن کریم کے مطابق فیصلے کرے جب ہم نے یہ عملی طریق اختیار کر لیا تو قرآن کریم کا یہ دعوےٰ سچا ثابت ہو کر سامنے آجائے گا کہ یہ کتاب نوعِ انسان کے اختلافات مٹانے کے لئے آئی تھی۔ اور اس میں آج بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ اُمت کے اختلافات مٹا سکے۔

سیاسی پارٹیاں

قرآنی نظامِ حکومت میں سیاسی پارٹیاں بھی باقی نہیں رہتیں۔ یہ پارٹیاں وحدتِ اُمت کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے پارٹی بازی کو سنگین جرم قرار دیا ہے۔ (مثلاً) جب حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا گیا کہ وہ فرعون کے خلاف اپنی مہم شروع کریں تو فرعون کے جرائم میں ایک شق یہ بھی تھی کہ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا (۲۸/۴) "فرعون نے ملک میں سرکشی اختیار کر رکھی ہے اور اس کے باشندوں کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا ہے"۔ یعنی فرعون کا یہ جرم اتنا سنگین تھا کہ اسے اس سے روکنے کے لئے حضرت موسیٰؑ کو مامور کیا گیا۔ قرآن نے کسی ملک میں پارٹیوں کے وجود کو، اس ملک کے لئے خدا کا عذاب قرار دیا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے۔ قُلْ ھُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِکُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِکُمْ۔ ان سے کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے۔ اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّ یُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ۔ یا تمہاری پارٹیاں بنا کر تمہیں آپس میں بھڑا دے اور (اس طرح) تمہیں ایک دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھا دے۔ اُنْظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّھُمْ یَفْقَھُوْنَ (۶/۶۵) "دیکھو! ہم کس طرح ان احکام و دلائل کو بار بار پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ بات کو سمجھ سکیں"۔

اس نظامِ حکومت میں ساری اُمت شریک ہوگی یعنی یہ ساری امت کے باہمی مشورہ سے قائم ہوگا اور تمام امور کے فیصلے، نمائندگانِ اُمت کے باہمی مشورہ سے، قرآن کریم کے مطابق کئے جائیں گے۔ اس میں حکومت کسی خاص پارٹی کی نہیں ہوگی۔ نہ ہی حکومت کے مقابلہ میں کوئی پارٹی ہوگی جو ہر وقت اس فکر میں لگی رہے کہ کسی طرح حکومت کو ناکام بنا کر، خود حکومت کی کرسیاں سنبھال لے بغیر کسی پارٹی کے اُمت کی مشترکہ حکومت، یہ ہے قرآنی نظام کی خصوصیت۔

اس وحدت سے، قاتوں اور برادریوں کی کش مکش ختم ہو جائے گی اور اس سے بنگالی اور غیر بنگالی، سندھی اور پنجابی، سرحدی اور بلوچی کا تفرقہ مٹ جائے گا۔ یہ سب دھارے، اُمت کے سمندر میں مل کر، خود سمندر بن جائیں گے۔ ہر ایک اپنے آپ کو مسلمان کہے گا، کہ یہی نام ہمارے خدا نے ہمارے لئے تجویز کیا تھا۔ (هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ ۲۲/۷۸)، اور مسلمان اور مسلمان میں کوئی تفریق یا مغائرت باقی نہیں رہے گی، سب آپس میں بھائی بھائی ہوں گے ــــ ایک دوسرے کے خیر خواہ، اور خدا کے سپاہی یعنی دنیا میں حق کے محافظ۔

اُمت میں از سرِ نو وحدت پیدا کرنے کے پروگرام کی ابتدا کسی ایک ملک سے ہونی چاہئے۔ اس کے لئے پاکستان سے زیادہ موزوں اور کوئی خطۂ زمین نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ پاکستان کا مطالبہ، تمام مسلمانانِ ہند نے نسلی، لسانی، قبائلی، صوبائی، مذہبی، فرقہ وارانہ، غرضیکہ ہر قسم کے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر، بیک زبان کیا تھا اور اس مطالبہ کی بنیاد اس آرزو پر تھی کہ ہم سب اس آزاد مملکت میں اسلامی انداز کی زندگی بسر کر سکیں۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد، ہم مختلف قسم کے مفادات میں اُلجھ کر رہ گئے اور وحدتِ ملت، اور اسلامی طرزِ زندگی کے بلند مقاصد ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ لیکن اب پھر حالات سازگار ہیں، اس لئے اگر ان مقاصد کے حصول کے لئے تھوڑی سی بھی کوشش کی جائے تو کامیابی کی بڑی امید کی جا سکتی ہے۔

پاکستان میں وحدتِ ملت

اگر ہم وحدتِ ملت کے اس تجربہ میں کامیاب ہو گئے تو یہ مسلمانانِ عالم کی وحدت کے لئے سنگِ بنیاد کا کام دے گا۔ ہم دیگر مسلم ممالک کے سامنے اس تجربہ کے درخشندہ نتائج کو پیش کر کے، انہیں اس کی طرف دعوت دے سکیں گے۔ یہی وہ اہم نکتہ تھا جس کی طرف محترم صدرِ مملکت پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے، اپنے حالیہ دورہ میں، قاہرہ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے عالمِ اسلام کی توجہ منعطف کرائی تھی جب انہوں نے کہا تھا کہ :-

وحدتِ ملت

براہ کرم ایک بات ضرور یاد رکھئے۔ ہم دنیا میں جہاں بھی ہوں، بہ حیثیت مسلمان، ہم پر اللہ کی طرف سے، اور خود اپنی طرف سے، ایک وفاشعاری عائد ہوتی ہے جو ہر وفاشعاری سے فائق اور

بات ہے۔ ہماری یہ وفا شعاری ہے ایمان کے ساتھ۔ یہ وہ عہدِ وفا ہے، جو تمام مسلمانانِ عالم کو، ہر قسم کے خارجی تنازعات یا سیاسی اختلافات کے باوجود، باہمی مودّت اور الفت کے محکم اور ناقابلِ شکست رشتہ میں منسلک کئے ہوئے ہے۔ یہ رشتہ، تمام سیاسی رشتوں سے زیادہ قیمتی اور مضبوط ہے۔ ہم میں جب تک یہ (ایمان کا) رشتہ قائم ہے، الجزائر کے مسلمانوں پر تشدد، فلسطینی مہاجرین کے مصائب، کشمیری مسلمانوں پر مظالم اور اسرائیلی حکومت کی طرف سے (آئے دن کی) دھمکیاں، پوری کی پوری ملّت کے دل میں یکساں طور پر جذباتِ ہمدردی پیدا کرنے کا موجب ہوں گے۔ آئیے، ہم خدا سے دعا کریں کہ باہمی محبت اور الفت کا یہ سرچشمہ، دن بدن وسیع اور گہرا ہوتا چلا جائے اور خدا ہمیں اس سے محفوظ رکھے کہ ہم ایسی متاعِ گراں بہا کو، وقتی مفاد یا ہنگامی جذبات کی قربان گاہ پہ ذبح کر دیں۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۱۰ نومبر سنہ ۱۹۶۱ء)

یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہا تھا کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

پھر یہ بھی واضح رہے کہ اُمّتِ مسلمہ کی یہ وحدت، دوسری اقوام یا ممالک کے خلاف (خدانخواستہ) کسی جارحانہ اقدام کے لئے نہیں ہوگی۔ یہ نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی تشکیل کے لئے خشتِ اوّل ہوگی،

وحدتِ انسانیت

اس لئے کہ (جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے) قرآن کریم کا نصب العین، پوری کی پوری انسانیت میں وحدت پیدا کرنا ہے۔ اس اُمّت کا مقصد جمعیت اقوام کے بجائے "جمعیت آدم" ہے۔ اور یہ جمعیت، ایمان (آئیڈیالوجی) کے اشتراک کے علاوہ اور کسی بنیاد پر استوار نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کا خدا، ربّ العالمین۔ ان کا ضابطہ زندگی، ذکر للعالمین، اور ان کا رسولؐ۔ رحمۃ للعالمین ہے۔ اور یہی وہ آئیڈیالوجی ہے جو تمام نوعِ انسانی میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔

من و یزداں
از پرویز
قیمت:۔ دس روپے
ملنے کا پتہ:۔ میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷۔بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

عربی حروف کیلئے "نقطے" کب ایجاد ہوئے

تاریخ، لغت اور اشعار جاہلیت کا انکشاف

—— محترم رحمت اللہ طارق ۔ دار الحدیث مکۃ المکرمہ

ریسرچ اور تحقیق کے میدان میں شاذ و نادر ہی کوئی گروہ ایسا ہوگا جو تبلیغی مقاصد بھی رکھتا ہو اور مخالف پر تنقید کرتے وقت حق و انصاف کا دامن بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا ہو۔ اس کلیہ کی صداقت اس وقت اور بھی نکھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ مستشرقین یورپ نے اپنے تبلیغی مقاصد کے پیش نظر اسلام پر جتنا کچھ مواد فراہم کیا ہے اس میں اسی فی صد اسلام اور پیغمبر اسلام، بالخصوص قرآن مجید پر طعن و تشنیع ہی کا مواد ملے گا کیونکہ شروع ہی سے ان کا مطمح نظر یہی رہا ہے اور اپنی تحقیقات کا محور اسی کو گردانا ہے کہ جس وار سے بھی قرآن لاریب فیہ کی پوزیشن مشکوک و مشتبہ ہو سکتی ہے اسے مختلف انداز سے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ عربی ہجاء کے اٹھائیس حروف میں سے بائیس کے قریب متشابہ حروف ہیں یعنی اگر نقطے اڑا دیئے جائیں تو ان میں امتیاز کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اب اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جب عربی خط اپنے ابتدائی ادوار میں "بے نقط" تھا تو ان متشابہ حروف میں امتیاز کرنے کی کیا صورت ہو سکتی تھی؟ چنانچہ اس مزعومہ عقیدے کی بنا پر انہوں نے یہ اعتراض کھڑا کر دیا کہ "قرن اوّل میں جب نقطوں کا رواج نہیں تھا یا اہل عرب اس سے آشنا ہی نہیں تھے تو قرآن کے سینکڑوں الفاظ جو قاری اپنی صوابدید کے مطابق پڑھا کرتے تھے وہ یا تو صحیح مانے جائیں یا سب کے سب غلط؟ صحیح ماننے کی صورت میں "تواتر" کا سوال ختم ہو جانا چاہیے اور غلط ماننے کے بعد صحت کا معیار باقی نہیں رہتا۔ مقصد یہ کہ قرآن مجید کی عصمت، حفاظت اور عظمت کا جو سکہ بیٹھ گیا ہے اسے کسی طرح نقصان پہنچایا جائے" لیکن —— "پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا"۔ فلسفۂ ابن رشد صدیوں سے یورپ کے رگ و پے میں

ہدایت کر چکا تھا اس کا اثر زائل کرنے کے لئے قرآن سے یوں بد دیانتی، خفت، ابلہی اور جہالت کی بدترین مثال ہے۔ تاہم اتنا کہہ کر ہم بھی سستی گلو خلاصی کے قائل نہیں ہیں۔ اگر اعتراض معقول ہے اور اپنے اندر وزن رکھتا ہے تو خالی عقیدت سے ہٹ کر علمی بنیادوں پر گفتگو کرنی چاہئے، بہرحال یہ غنیمت ہے کہ غیر مسلم مشنریوں نے جاہلی لٹریچر کے وجود سے نہ تو انکار کیا ہے اور نہ ہی جاہلی شواہد سے استدلال کو رد کیا ہے

کچھ عرصہ ہوا راقم الحروف نے لاہور کے ایک مشہور ہفت روزہ میں قرآن سے متعلق بعض مضامین تحریر کئے تھے جو الحمد للہ اپنے موضوع میں کامیاب رہے (خطوط سے بھی اندازہ ہوتا ہے) ان میں سے ایک کا ذیلی عنوان تھا "نقاط القرآن" اور تمام مضامین میں یہی حصہ زیادہ وضاحت طلب تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ متعلقہ مواد نہ ملنے کی وجہ سے یہی حصہ تشنہ رہ گیا۔ چنانچہ اس دن سے تادم تحریر مسلسل ایسے مواد کی تلاش رہی جو تصویر کے دوسرے رُخ کو پوری وضاحت سے پیش کر سکے آج الحمد للہ اس سلسلہ میں فکر و نظر کی کتنی وادیاں طے کرنے اور تحقیق و جستجو کے کتنے راستوں پر آبلہ پائی کرنے کے بعد ان کا ماحصل متلاشیانِ حق و صداقت کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ مضمون کی ترتیب اور بیسیوں کتابوں کی فراہمی اور حرم مکی کی وسیع و عریض لائبریری سے استفادہ، پھر اخذ و استنباط کے لئے شواہد اور جاہلی لٹریچر سے متعلق دواوین کی تلاش اور پھر مقصد کے تعین میں جتنی محنت صرف ہوئی اس کا بدلہ یہی چاہتا ہوں کہ جن کے دل میں اسلام، قرآن اور سنت کی قدر اور محبت ہے وہ اسے کسی سوء ظن پر محمول نہ کرتے ہوئے پورے شغف اور انہماک سے پڑھیں یہ ایک طالب علم کی ادنیٰ پیش کش ہے اور پھر اُردو میں اپنی نوعیت کا یقیناً پہلا مقالہ ہے جس میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے آپ اسے غور سے پڑھئے ممکن ہے آپ غلطیوں کی اصلاح میں معاون و مددگار ثابت ہو سکیں۔ وباللہ التوفیق۔

نوٹ:- یہ قطعاً غیر مذہبی اور غیر سیاسی مقالہ ہے آپ صرف علمی نقطۂ نظر سے تعاون فرمائیں۔

اُمّیّت کا مفہوم

یہاں ضمناً اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ اصل مضمون یعنی "عربی خط میں نقطوں کا رواج" سے پہلے اُمّیّت کا مفہوم اور عربی خط کی ابتداء پر دو ذیلی اور تعارفی نوٹ دیئے جاتے ہیں تا کہ آگے چل کر "مضمون کا اصل حصہ آپ کی دلچسپی کا باعث بن سکے" وھو ھذا

عام طور پر ہمارے ہاں امیت (ان پڑھ ہونے) کو فضائل نبوت میں شمار کیا جاتا ہے، اس سے بحث نہیں لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ تمام عرب تھے ہی ان پڑھ تو اس کی صحت مشتبہ اور صداقت غیر یقینی ہے امام ابن فارس ابو الحسین احمد بن فارس بن زکریا (متوفی ۳۹۵ھ / ۱۰۰۴ء) نے اس نظریہ کی شدید مخالفت کرتے ہوئے "الصاحبی" میں سینکڑوں صحابہ اور مشرکین کے نام گنوائے ہیں جو پڑھے لکھے اور مختلف علوم و فنون میں اچھی دسترس رکھنے والے تھے اور بعد میں لکھا ہے کہ وما العرب فی قدیم الزمان الا کنحن الیوم فما کل یعرف الکتاب والخط والقراءۃ یعنی قدیم زمانے کے عرب ہماری ہی طرح تھے، جس طرح ہم میں سے ہر

شخص لکھا پڑھا نہیں ہوتا اسی طرح ان میں بھی سب کے سب نہ تو اَن پڑھ تھے اور نہ ہی پڑھے لکھے (الصاحبی ج ۸ ص ۱۱ طبع مصر ۱۹۱۰ء)

بعض لوگ اور خاص کر مستشرقین جب یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن نے جاہل طبقہ کو للکارا اور انہیں ہی ہر میدان میں دعوت مقابلہ دیتا رہا اور اگر کسی مہذب یا تعلیم یافتہ سوسائٹی کو مخاطب کرتا تو یقیناً اس کی اعجازی طاقت کا پول کھل جاتا۔ تو وہ اپنی تائید میں قرآن حکیم کی ان آیات (آل عمران ۲۰ و ۷۵ - جمعہ ۲) سے بھی استدلال کرتے ہیں یعنی ان میں "امیین" کا لفظ مذکور ہوا ہے جس سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ اَن پڑھ ہی تھے وغیرہ۔ لیکن ہماری رائے میں یہاں امیت سے مراد کتابی امیت ہے علمی امیت نہیں۔ یعنی قرآن سے پہلے ان کے پاس ایسی دینی کتاب نہیں تھی جس طرح کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے پاس تورات و انجیل تھے۔ علامہ حسنین محمد مخلوف کلمات القرآن میں امیین کے ذیل میں ایک جگہ لکھتے ہیں "مشرکی العرب" یعنی عرب کے مشرک (ص ۴۳) دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں "العرب المعاصرین له ﷺ" یعنی وہ عرب جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر تھے (ص ۳۴۶) پھر یہ نہ صرف ہماری یا مخلوف کی اپنی رائے ہے بلکہ قرآن حمید کی ذیل کی آیت سے بھی یہی کچھ مستفاد ہوتا ہے۔

ومنهم اميون لا يعلمون الكتاب الا اماني وان هم الا يظنون فويل للذين يكتبون الكتاب بايديهم ثم يقولون هذا من عند الله ليشتروا به ثمنا قليلا فويل لهم مما كتبت ايديهم وويل لهم مما يكسبون (البقرہ ۷۸ تا ۷۹) حاصل ترجمہ یہ کہ۔ ان میں ایک فریق ایسا بھی تھا جو امی یعنی علم کتاب سے ناآشنا تھا۔ ہاں جھوٹ موٹ کا تو انہیں علم تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف) ان کو اپنا ظن و قیاس تھا۔ پس جو لوگ جناب منفعت کے لئے اپنے ہاتھوں کی تحریر کو کتاب اللہ کہہ کر لوگوں کو سستے داموں بیچتے ہیں ان کے حال پر نہایت افسوس ہے (بلکہ) ان کا یہ عمل اور جو کچھ انہوں نے اس (عمل) کے ذریعہ کمایا سب سامان ہلاکت کی تمہید ہے۔

اب یہاں اگر کتابی امیت مقصود نہ ہوتی تو اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے لکھنے کی خبر کیونکر دیتا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ دین کا انکار کر رہے تھے اور دین ہی سے جہالت کے بعد ان کا تو سیدھا ہو سکتا تھا ——— وہ نفس تعلیم سے آشنا تھے مگر صاحب کتاب نہیں تھے یعنی کتابی امی تھے۔ مفسر ابن جریر طبری (م ۹۲۳ء) اپنی اسناد سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ (متوفی ۶۸۶ء) سے روایت کرتے ہیں کہ الاميون قوم لم يصدقوا رسولا ارسله الله ولا كتابا انزله الله فكتبوا كتابا بايديهم ثم قالوا لقوم سفلة جهال هذا من عند الله وقال قد اخبر انهم يكتبون بايديهم ثم سماهم

امیین یجحود ھم کتاب اللہ و رسولہ یعنی امیوں سے وہ قوم مراد ہے جس نے نہ تو کسی رسول کی تصدیق کی اور نہ ہی کسی کتاب الٰہی پر ایمان لے آئی (اس کے باوجود) اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھ کر نچلے درجے کے جاہلوں سے کہتے تھے کہ یہ کتاب الٰہی ہے۔ (حضرت ابن عباسؓ نے مزید کہا کہ) اللہ تبارک نے خبر دی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے پھر بھی انہیں امّی کہا (یعنی اَن پڑھ) یہ اس لئے کہ وہ دراصل حقیقی اَن پڑھ نہیں تھے۔ کتاب اللہ اور رسول اللہ کے انکاری تھے (تفسیر طبری شائع کردہ محمود محمد شاکر جلد دوم صفحہ ۲۵۵ و صفحہ ۲۵۹۔ نیز الہمۃ فی الشعر الجاھلی ڈاکٹر احمد محمد حوفی طبع مصر صفحہ ۳۳۳ و صفحہ ۳۳۴)۔ ان آیات الٰہی کے علاوہ بعض لوگ "امیت" کے ثبوت میں ارشادات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سہارا بھی لیتے ہیں یعنی ان کا کہنا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھنے سے نہ صرف منع فرمایا بلکہ لکھے ہوئے کو محو کرا دیا۔[1] لیکن ایسے حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنے سوءِ ظن کی کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کے کسی بھی ارشاد کو ایسے غلط مفہوم پر محمول کرنا نہ صرف خوفِ خدا سے بعید ہے بلکہ علمی دیانت داری کے بھی منافی ہے قرآن حکیم میں ن۔ والقلم وما یسطرون۔ یعنی قلم اور قلم سے تحریر کی ہوئی چیزوں کو گواہ بنا کر علم اور تحریر کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی گئی ہے بلکہ در پردہ لکھنے اور پڑھنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ کیا ایسے حکم کی موجودگی میں رسول اللہ اپنی اُمت کو اَن پڑھ بنا سکتے تھے؟ صلی اللہ علیہ وسلم۔ امام خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) نے "تقیید العلم" میں پہلے تمام ان احادیث کا استقصا ذکر کیا ہے جن میں لکھنے کی ممانعت ہے پھر اثبات کی احادیث لا کر بعد میں جو تبصرہ کیا ہے وہ ہمارے خیال میں ارشادات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بہترین توجیہ ہو سکتی ہے خطیب کہتا ہے کہ

"ان دونوں قسم کی احادیث کو ملانے سے واضح ہو جاتا ہے کہ صدرِ اول میں جن لوگوں نے کتابت کو ناپسند کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی اور تصنیف کتاب اللہ کے ہم پلّہ قرار نہ پا جائے اور کہ لوگ کتاب اللہ کے ماسوا کسی اور تحریر میں منہمک ہو کر کتاب اللہ سے بے نیاز نہ ہو جائیں۔ اسی بنا پر ہی قدیم مقدس کتابوں (تورات و صحیفہ دانیال وغیرہ) کی تلاوت سے صحابہ کو روک دیا گیا تھا کیونکہ ان میں (اس وقت) حق و باطل، صحیح اور فاسد کا امتیاز مشکل ہو چلا تھا اب صرف قرآن ہی کافی تھا اور اسے ہی ان پر مہیمن (نگران) بنایا گیا تھا۔ پھر یہ وجہ بھی تھی کہ صدرِ اول میں ایسے فقیہ (سمجھدار) کاتبوں کی قلت تھی جو وحی اور غیر وحی میں امتیاز کرنے پر قادر ہو سکتے۔ کیونکہ عربوں کی اکثریت

---

[1] یہ صرف احادیث (غیر از قرآن) کے لکھنے کے متعلق تھا مطلق کتابت کے متعلق نہیں تھا۔ قرآن کریم کی کتابت میں خود نبی اکرمؐ نے جس قدر اہتمام فرمایا اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ (طلوعِ اسلام)

تفقہ فی الدین ہی میں جب فائق نہیں تھی اور نہ ہی انہیں دین کی تفصیلات کا علم رکھنے والے صحابہؓ اور علماءؒ کی صحبت نصیب تھی (تفقہ فی الکتابت تو دور کی چیز رہی) تو ایسے میں اندیشہ تھا کہ یہ لوگ جو کچھ صحائف (کاپیوں) میں لکھا ہوا پاتے اسے قرآن ہی سے ملحق کر دیتے اور پھر آہستہ آہستہ یہ عقیدہ رکھنے لگ جاتے کہ جو کچھ ان صحائف میں شامل ہے وہ کلام الرحمان ہی ہے (تقیید العلم ص۵۷ طبع دمشق ۱۳۴۹ھ)

خطیب نے اس توجیہ میں کہا ہے کہ فقیہ کاتبوں کی قلت تھی یہ نہیں کہا کہ عام طور پر کوئی کتابت جانتا ہی نہیں تھا۔ امید ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کی روشنی میں امیت کا مفہوم واضح ہو چکا ہوگا۔ اب آپ عربی خط کی ابتداء کی طرف آئیے۔

عربی خط کی ابتداء

نقطوں سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عربی خط کی ابتداء کب سے ہوئی؟ کیونکہ جب تک کسی چیز کی ابتداء معلوم نہ ہو عوارض اور لوازمات کا علم غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس سوال کا جواب نہ صرف مشکل ہے بلکہ محال بھی ہے کیونکہ عرب روایات اور مستشرقین کے اقوال اس قدر باہم متضاد، متعارض اور مختلف فیہ ہیں جن کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا نہ صرف دشوار بلکہ مایوس کن ہے تاہم عرب روایات کی رو سے جہاں تک ظن غالب کا تعلق ہے اس کی ابتداء ہجرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دو سو سال پہلے لخمی ایمپائر کے دارالسلطنت مرکز حیرہ (موجودہ کوفے سے ۳ ۱/۲ میل کے فاصلہ کے مقام پر) سے ہوئی۔ (در اصل شاہانِ بنو لخم یمن سے نکل کر شام اور فلسطین چلے آئے تھے اور یہاں پہنچ کر انہوں نے نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی)۔ اور انہوں نے "انبار" سے عربی خط سیکھا۔ انبار کالیڈیا میں فرات کے شمالی کنارے پر ایک قدیم اور متمدن شہر تھا جسے سنہ ۱۲ھ میں حضرت خالد بن الولیدؓ نے فتح کیا۔ اور انبار نے یمن کے حمیری خط کی نقل اتاری۔ حمیری یمن کے قدیم باشندے تھے جو سینکڑوں برس سے اپنی امتیازی خصوصیات اور علوم و فنون میں کمال دستگاہ رکھنے سے مشہور تھے انہوں نے آخری وقت میں قسطنطین دوم (رومی ایمپائر کا نمائندہ سنہ ۳۶۱ء) کے عہد میں عیسائیت قبول کی۔ بہرحال حمیری خط کی ابتداء قحطانی عرب کے بولان قبیلہ کے تین افراد نے کی۔ بولان کا مورث اعلیٰ عضین بن عمرو بن الغوث بن طی بن داد بن زید بن یشجب بن عریب بن زید ون بن کہلان تھا اس قبیلہ کے جن تین افراد نے عربی خط کو سنوارا اور نقطے ڈالے ان کے نام "نقطوں" کے عنوان میں ملاحظہ فرمایئے (نیز مزید تفصیل کے لئے ذیل کی کتابیں ملاحظہ ہوں۔ فتوح البلدان ص۴۷۶ و ۴۷۷۔ کتاب المصاحف ص۴ و ۵۔ العقد ابن عبد ربہ ص۲۴۰۔ الوزرآء والکتاب ص۱۲ و ۱۳۔ ادب الکاتب صولی ص۲۸ تا ۳۰۔ ابن خلدون حصہ ۲ ص۔ التنبیہ علی حدوث التصحیف قلمی تیموری کتب خانہ مصر ص۲ تا ۵۔ صبح الاعشیٰ ص۳ و ۱۱۔ تاریخ اللغات السامیہ ولفنسن ص۱۹۰ و ۱۹۱۔ مجلۃ کلیۃ الآداب مئی ۱۹۳۵ء۔ ابن الندیم ص۷ تا ۹ وغیرہ)۔

ان تاریخی نصوص (و تصریحات) سے واضح ہوا کہ جس طرح ہجرتِ نبوی سے دو سو سال پہلے ۔ اہل حیرہ سے عربی خط کا آغاز ہوا ۔ اتنا ہی عرصہ پہلے انبار اور حمیری قبیلے اس کی ابتدا کر چکے تھے یعنی دوسری یا تیسری صدی میلادی کے قریب اور عرب روایات کی تائید اُن حجری نقوش اور بردی کے چیتھڑوں پر لکھی ہوئی عبارتوں سے بھی ہوتی ہے جن کا زمانہ دو سو دس مسیح (۲۱۰ء) سے شروع ہو کر پانچ سو گیارہ مسیحی تک پہنچتا ہے ۔ چنانچہ اس وقت تیسری صدی مسیحی تک کے جو نقوش دریافت ہوئے ہیں ان کی تعداد پانچ بتائی جاتی ہے ۔ اور وہ یہ ہیں ۔

۱ ۔ وہ تحریر جو سقوطِ سلع کے بعد سنہ ۱۰۴ھ میں لکھی گئی (یعنی سنہ ۲۱۰ء میں) اس کا طرزِ تحریر اسلامی خط کے ابتدائی دور سے ملتا جلتا ہے ۔ حتیٰ کہ پہلی سطر کا چوتھا لفظ (بن) اور پانچویں سطر کا پہلا لفظ (بمعلق) اسلامی عربی خط کے بالکل مشابہ ہے ۔

۲ ۔ دوسری تحریر جو پہلی تحریر کی طرح وادیٔ سینا کے قران جزیرہ میں دریافت ہوئی اس پر سقوطِ سلع کے بعد سنہ ۱۶۲ھ درج ہے (یعنی سنہ ۲۶۸ء) اس کی پہلی سطر کا لفظ (مسلمه) اور آخری سطر کا لفظ (بمعن) صاف پڑھے جاتے ہیں ۔

۳ تیسری تحریر بھی وادیٔ سینا میں دریافت ہوئی جس پر سقوطِ سلع کے بعد سنہ ۱۴۷ھ درج ہے (یعنی سنہ ۲۵۳ء) اس کی پہلی سطر کا دوسرا لفظ (کاتب) اور اسی سطر کے دو آخری لفظ (بن عمرو) موجودہ عربی خط سے ملتے جلتے ہیں ۔

۴ چوتھا نقش شمالی حجاز (مدینہ منورہ سے تقریباً ۳ سو میل) کی وادیٔ حجر کے " مدائن صالح " میں برآمد ہوا جس کی تاریخ سقوطِ سلع کے بعد سنہ ۱۶۲ھ کی طرف لوٹتی ہے (یعنی سنہ ۲۶۷ء) اس کی پہلی سطر کا آخری لفظ (بنت) اور تیسری سطر کا پہلا لفظ (عمد) اور چھٹی سطر کا آخری لفظ (لعن) اور نویں سطر کا دوسرا لفظ وہی (لعن) صاف پڑھا جاتا ہے ۔

۵ ۔ ان سب سے جو نقش بعد میں دریافت ہوا وہ حوران منطقہ کے ام الجمال گاؤں میں بغیر تاریخ کے ملا ہے لیکن کانٹ (DEVOGUE) وغیرہ کے خیال میں یہ نقش سنہ ۲۷۰ء میلادی کا ہے ۔ اس کی دوسری سطر کا دوسرا لفظ ایک نام (سلی) اور اسی سطر کا آخری لفظ (رجن بمسه) اور تیسری سطر کا پہلا لفظ (ملك) ہے جو بالکل صاف لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔

چوتھی صدی مسیحی اس صدی میں صرف ایک ہی تحریر ۔ حوران منطقہ کے مرکزی شہر نمارہ میں عرب کے بادشاہ امرؤ القیس بن عمرو کی قبر سے دریافت ہوئی ہے ۔ کہنے کو تو پوری صدی کی یہ ایک ہی تحریر ہے لیکن عربی رسم الخط کی تاریخ میں اس کی اہمیت اور قدر و قیمت سابقہ تمام تحریروں سے زیادہ ہے کیونکہ اس کے اکثر

بلکہ قریب قریب سب کے سب الفاظ اپنی ہیئت ترکیبی اور صورت خطی کے لحاظ سے اسلام کے ابتدائی رسم الخط کے مشابہ ہیں اس کی پہلی سطر کا دوسرا تا ساتواں کلمہ اس طرح ہے "نفس امرالقیس بن عمرو ملک العرب" اور دوسری سطر کا پہلا تا چھٹا کلمہ اس طرح ہے "وملک الاسدین ونزرو وملوکہم وھرب مذحجو" اور تیسری سطر کا پہلا اور پانچواں تا آخر کلمہ اس طرح ہے "الشعوب ..... فلم یبلغ ملک مبلغہ" اور چوتھی سطر کا پہلا، دوسرا اور تیسرا لفظ اس طرح ہے "عکدی (توفی) ھلک - سنۃ"

الغرض یہ تحریر صورت خطی کے علاوہ زبان اور ادب وصوت کے لحاظ سے بھی زیادہ تر عربی ہی ہے بلکہ یہ تاریخ کے ایسے مرحلہ میں پہنچا دیتی ہے جس کی رو سے ہم عربی خط کے تدریجی ارتقاء اور تبدیلیوں کا صحیح اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد آخر میں سقوط سلع کے بعد ۲۲۳ھ یعنی ۳۲۸ء درج ہے۔

چھٹی صدی میلادی

اس صدی کے تاحال دو نقش ملے ہیں پہلا نقش قنسرین اور فرات کے مابین "زبد" کے کھنڈرات میں دریافت ہوا جس کی تاریخ ۵۱۱ء میلادی کی طرف لوٹتی ہے یہ نقش تین زبانوں یونانی، سریانی اور عربی میں کندہ کرایا گیا تھا اس کا رسم الخط اسلامی عہد کے کوفی رسم الخط کے مشابہ ہے بلکہ چند ایک کے ماسوا اس کے تمام تر الفاظ بھی عربی ہی ہیں۔ الا یہ کہ اس کے بعض حروف ابھی تک صحیح طور پر نہیں پڑھے جا سکے مثلاً پہلی سطر اس طرح ہے "...... الالہ شرحو بر ...... منفو ....
برامرئ القیس" دوسری سطر یوں ہے "وشرحو بر سعد و وستر و وشریحو"

دوسرا نقش سقوط سلع کے بعد ۴۶۳ھ یعنی ۵۶۸ء میلادی کا ہے جو شام کے شمالی علاقے میں جبل دروز سے متصل حران (شہر) کے "لیجا" گرجا گھر میں ملا ہے اس پر یونانی اور عربی میں اس طرح لکھا ہوا ہے پہلی سطر "انا شرحیل بن ظالمو بنیت ھذا المرطول" دوسری سطر "سنۃ ۴۶۳" تیسری سطر "خیبر" چوتھی سطر "بعام" - ولفنسن (تاریخ اللغات السامیہ ص۱۹۲) میں لکھتا ہے کہ امراء بنی غسان میں سے حارث بن ابی شمر نے خیبر کو تاخت و تاراج کر کے لوگوں کو غلام بنایا اور غلام بنا کر پھر رہا کر کے شام کی طرف رخ کیا اس تحریر میں اسی واقعہ کا ذکر ہے۔

ان نقوش میں پانچویں صدی میلادی کا نقش نہیں ملا۔ اور یہی وہ خلا ہے جسے علمائے لسانیات پر کرنے کی ان تھک محنت کر رہے ہیں کیونکہ اس کے بغیر عربی تحریر کی تاریخ کا تسلسل غیر مربوط ہو جاتا ہے لیکن عرب کے ریتلے صحرا، پہاڑی غار اور سینکڑوں تباہ شدہ شہر جو کھدائی کے انتظار میں ساکت و صامت کھڑے ہیں، ان کی کھدائی نہ صرف اس تسلسل کو ٹوٹنے سے بچائے گی بلکہ بہت سے اسرار و غوامض سے بھی نقاب کشائی کی توقع کی جا سکتی ہے

ان تمام تحریروں اور نقوش کے عکس بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جو بہ "کتاب" مصادر الشعر الجاہلی مصنفہ ڈاکٹر ناصر الدین

پی ایچ ڈی) قاہرہ طبع اول سنہ ۱۹۵۹ء صفحہ ۲۸ - ۳۰ پر ملاحظہ ہوں)۔ ان نقوش سے اتنا پتہ چلا کہ عربی خط اسلام سے بلاواسطہ دو سو سال اور بالواسطہ چار سو سال پہلے رائج ہو چکا تھا اور ان شخصوں کے بلند مذاق کی وجہ سے تمام عیوب و نقائص سے اسے پاک وصاف رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ پاک وصاف سے مراد۔ خط کی نوک پلک یا تہذیب مراد نہیں ہے بلکہ وہ عیوب جو ایک کثیر الاشتقاق زبان میں ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد اسلامی عہد کا آغاز ہوتا ہے یہاں پہنچ کر ہمیں انتہائی مایوسی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی بے توجہی سے قرن اول کا اتنا قیمتی اثاثہ یوں لاپروائی کی نذر ہو گیا کہ آج ہم پورے وثوق سے کلام پاک کا کوئی نسخہ بھی موجود نہیں پاتے[1]۔ تاہم اتنا غنیمت ہے کہ تاریخ کے بے رحم ہاتھوں سے بچ بچا کر اس مبارک عہد کی دو تحریریں اس وقت بھی ہمارے پاس موجود ہیں اور اب ہم عربی تاریخ کے ضمن میں اخذ نتائج اور استنباط میں بھٹک نہیں سکتے۔ پہلی تحریر حضرت عثمان بن عفانؓ (شہید سنہ ۳۵ھ) کے زمانے کی ہے جس پر اکتیس (۳۱) ہجری کی تاریخ درج ہے۔ یعنی سنہ ۶۴۳ء میلادی۔ یہ تحریر "عربک میوزیم" قاہرہ میں نمبر ۹ محفوظ ہے۔

دوسری تحریر بحمد اللہ اس سے بھی قبل کی ہے یعنی غزوہ خندق سنہ ۵ ہجری (مطابق سنہ ۶۲۶ء) کی جو کہ مدینہ منورہ کی سلع پہاڑی کی جنوبی چوٹی سے برآمد ہوئی (تفصیل ملاحظہ ہو مصادر الشعر الجاہلی صفحہ ۳۱ تا صفحہ ۳۲)

اس تفصیل سے آپ نے اتنا تو معلوم کر لیا کہ عربی خط کی ابتدا اسلام سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اب رہا یہ سوال کہ ان کتبات و نقوش میں سے اکثر ایسے ہیں جو نقطوں سے عاری ہیں۔ تو اس کے متعلق ذیل کی معروضات حاضر ہیں۔ یہی وہ معروضات ہیں جن کے لئے آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔

نقطوں کی ابتداء

سابقہ سطور میں دس کتابوں کے حوالے سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ عربی خط کی ابتداء اسلام سے محتاط اندازے کے مطابق چار سو سال پہلے ہو چکی تھی اور اسے مہذب بنانے، درجۂ کمال تک پہنچانے اور لفظی تشابہ دور کرنے والے بولان قبیلہ کے تین افراد تھے۔ ان تین افراد میں سے ایک کا نام عامر بن جدرہ تھا جس نے عربی خط میں نقطوں کا اضافہ کیا۔ یہ روایت فنی لحاظ سے اگرچہ اتنا فائدہ نہیں دے سکتی جتنا کہ مطلوب ہے تاہم تاریخی طور پر ہم آسانی سے اتنا سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ الاعجام (نقطوں) کے موجودہ مفہوم سے آشنا ضرور تھے اور کہ یہ لفظ (الاعجام) اپنے اسی مفہوم میں حضرت ابن عباسؓ سے پہلے بھی ملک میں مشہور اور معروف تھا۔ یا کم از کم حضرت ابن عباسؓ سے نچلا راوی اس کے مفہوم سے پوری طرح واقف تھا اور اسی طرح لوگوں کے لئے بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں اجنبی نہیں تھا جب ہی تو انہوں نے راوی کی سنی اور سن کر اسے تسلیم کر لیا۔

بہرحال یہ بات کہ نقطوں کے موجد حجاج بن یوسف (متوفی سنہ ۹۵ھ) یا یہ شہرت کہ ابوالاسود دؤلی (متوفی سنہ ۶۹ھ)

---

[1] غالباً یہ کہنا مقصود ہے کہ نبی اکرمؐ کے عہد مبارک کا لکھا ہوا قرآن کریم کا کوئی نسخہ اس وقت تک دریافت نہیں ہوا۔ — طلوع اسلام

تھے قطعاً غلط اور ثبوت کے لحاظ سے تاریخ پر افترا ہے کیونکہ نقطوں اور عربی خط کی ابتداء ان کے پیدا ہونے سے پانچسو سال پہلے ہو چکی تھی۔ مشہور مؤرخ و نساب اور نحوی امام احمد بن علی بن احمد المعروف القلقشندی (متوفی ۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء) اپنی شہرہ آفاق کتاب صبح الاعشیٰ جلد سوم صفحہ ۱۵۵ پر لکھتا ہے کہ

"والظاهر ما تقدم يعني ان الاعجام موضوع مع وضع الحروف اذ يبعد ان الحروف قبل ذالك مع تشابه صورها كانت عرية عن النقط الى حين نقط المصاحف" یعنی اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ جوں ہی عربی کے حروف وضع کئے گئے تھے نقطے بھی ساتھ ہی وضع کئے گئے تھے کیونکہ یہ بعید از عقل ہے کہ صوری مشابہت کے باوجود عربی حروف کو اس وقت تک نقطوں سے خالی رکھا گیا جب تک کہ مصحف پر نقطے نہیں ڈالے گئے۔ (نیز ملاحظہ ہو مفتاح السعادۃ و مصباح السیادۃ لاحمد بن مصطفےٰ عرف طاش کبریٰ زادہ متوفی ۹۶۸ھ/۱۵۶۱ء جلد اول ۷۸ طبع مصر)

مصحف نبویؐ پر بھی نقطے تھے

سلف صالحین کا یہی عقیدہ تھا اور ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہئے کہ قرآن مجید پر زبر، زیر، پیش (اور نقطوں) جیسا بنیادی اور عظیم کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی سرانجام دے گئے تھے (اتقان صفحہ ۱۴۴ تا ۱۴۷) بلکہ آپ نے اپنی امت کو حکم دے دیا تھا کہ اعربوا القرآن یعنی قرآن پر اعراب لگاؤ۔ (بیہقی، ابو یعلی بحوالہ مشکوٰۃ صفحہ ۱۸۹، جامع صغیر جلد اول صفحہ ۴، منتخب کنز العمال جلد اول صفحہ ۳، تاریخ خطیب جلد ۷ صفحہ ۷۷، بغیۃ الوعاۃ صفحہ ۵۸، فضائل ابن کثیر ملحق بہ تفسیر ابن کثیر صفحہ ۲۰ وغیرہ) یہاں اعراب سے مراد تحریر کے تمام وہ قواعد و ضوابط ہیں جو عہد نبویؐ میں رائج تھے تنہا زبر، زیر، و پیش نہیں کیونکہ حقیقی تشابہ نقطوں ہی سے دور ہو سکتا تھا۔

بہرحال اس امر نبویؐ کے مطابق مصاحف نبویؐ پر نقطے لگائے گئے لیکن اس کے بعد پھر کیا ہوا؟ اس کی تفصیل عرض ہے۔ امام شمس الدین محمد بن عرف جزری (متوفی ۸۳۳ھ/۱۴۲۹ء) لکھتے ہیں کہ "ثم ان الصحابة رضي الله عنهم لما كتبوا تلك المصاحف جردوها من النقط والشكل ليحتمله ما لم يكن في العرضة الاخيرة مما صح عن النبي صلى الله عليه وسلم" یعنی بعد میں جب صحابہ کرامؓ نے نبوی مصاحف کو لکھنا شروع کیا تو انہوں نے نقطے اور دیگر علامات کو اڑا دیا کیونکہ جو الفاظ مختلف قراتوں سے پڑھنا ثابت تھے (کہاں ثابت تھے؟ ثبوت ندارد ...... طارق) — اب دیکھنا یہ تھا کہ ان الفاظ کو آخری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح تلاوت فرمایا، تاکہ جمع [illegible] فیصلہ کے بعد ہی آخری قرأت کو ضبط تحریر میں لایا جائے (اور نقطوں سے اس چیز کا پہلے ہی تعین ہو جاتا تھا جو کہ ناقلین کو منظور نہیں تھا۔ ط)۔ (النشر فی القرأت العشر طبع دمشق جلد اول صفحہ ۳۲ تا ۳۳ طبع قاہرہ صفحہ ۳۳)۔

امام جزری نے مذکورہ کتاب اختلاف قرأت کو ثابت کرنے کے لئے لکھی ہے مگر نقاط کے ضمن میں انہیں یہ اعتراف کرنا ہی پڑا کہ صحابہ کرامؓ نے حذف کر دیئے تھے (رسول اللہؐ نے لگوا دیئے تھے) حضرت عبداللہ بن مسعودرضؓ (متوفی ۶۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ جرّدوا القرآن لیربو فیہ صغیرکم ولا ینأی عنہ کبیرکم۔ یعنی قرآن کو نقطوں سے صاف کر دو تاکہ چھوٹے بھی اسی طرح پڑھتے رہیں اور بڑے بھی دور نہ جائیں، مقصد یہ کہ انہیں ذہن پر زور دے کر الفاظ حل کرنے پڑیں گے اور اس طرح وہ قرآنی ماحول ہی کے رہ جائیں گے یعنی کسی بہانے قرآن ہی ان کی دلچسپی کا مرکز ہوگا۔ بہرحال حضرت ابن مسعودؓ کے اسی جرّدوا کی تفسیر میں امام زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) لکھتے ہیں کہ اراد تجریدہ عن "النقط" والفواتح والعشور لئلا ینشأ نشءٌ فیریٰ انہا من القرآن۔ یعنی جرّدوا سے ان کی مراد یہ ہے کہ قرآن کو نقطوں اور سورتوں کے تعارفی فقروں مثلاً "سورۃ الفاتحہ مکیہ وہی سبع آیات" اور ہر دس آیات کے بعد (اس زمانے میں) ایک آیت لگانے کا جو رواج تھا انہیں حذف کرنا چاہئے کیونکہ آگے چل کر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ یہ بھی عین قرآن ہی ہیں (الفائق زمخشری جلد اول ص ۱۹۰ طبع مصر) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان (اعربوا) اور عمل (تنقیط المصاحف) کے برعکس ان علامات و رموز کو اڑا دیا گیا۔ خیر اس سے بحث نہیں۔ تاہم ان دو حوالوں سے اتنا تو واضح ہو ہی گیا کہ حجاج اور دؤلی سے پہلے ہی صحابہ کرامؓ "نقطوں" کے موجودہ مفہوم سے بخوبی آشنا تھے اور کہ یہ نقطے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مصاحف پر باقاعدہ لگائے گئے تھے لیکن نقل ثانی کے وقت یا بالفاظ دیگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد نقطوں کو جان کر حذف کر دیا گیا۔ (روایات کی روشنی میں۔ طارق)

یہاں یہ وضاحت کر دی جائے کہ بعض لوگوں نے "تجریدہا" سے مراد تفسیر، تشریح، حدیث یا قصہ وغیرہ بھی لی ہے یعنی ان چیزوں کو قرآن سے الگ کر دیا جائے لیکن امام جزری اور امام زمخشری کی طرح قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی (متوفی ۵۴۳ھ) نے بھی تجریدہ سے نقطے ہی مراد لئے ہیں اور اس پر اس نے تفصیل سے لکھا ہے کہ اس طرح صحابہ کرامؓ اختلافِ قرأت کا حق محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ کیونکہ نقطے ڈالنے سے قرأت کا خود بخود تعین ہو جاتا تھا تفصیل ملاحظہ ہو۔ العواصم من القواصم لابن العربی طبع الجزائر جلد دوم ص ۱۹۶ - ۱۹۷۔

صحابہ کرامؓ نقطے لگاتے تھے

امام ابوزکریا یحییٰ بن زیاد عرف فرا نحوی (متوفی ۲۰۷ھ) روایت کرتے ہیں کہ سفیان بن عیینہ (متوفی ۱۹۸ھ) نے اپنی سند سے ہمیں حدیث بیان کی کہ کتب فی حجر لم یتسن ولم یتسنہ۔ (الحدیث) یعنی ایک پتھر پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ اب جو میں دیکھتا ہوں تو زید بن ثابتؓ (متوفی ۴۵ھ) نے پہلے لفظ پر چار نقطے ڈال دیئے یعنی سین پر تین نقطے ڈال کر شین بنا دیا اور را پر ایک نقطہ ڈال کر زا میں تبدیل کر دیا۔ اسی طرح دوسرے

لفظ میں نقطوں کے علاوہ سین کے بعد حاء کا اضافہ کر کے لم یتسنہ بنا دیا (معانی القرآن فرّاء جلد اول صہ ۱۷۲ صہ ۱۷۳ ۔ طبع مصر) ۔ کیا حضرت زید بن ثابتؓ نقطوں کا علم نہ رکھتے تھے یوں ہی قرآن میں سین کو شین اور راء کو زا بنا لیتے تھے؟ کیا یہ کام بغیر واقفیت کے ممکن ہو سکتا تھا؟ ہمارے خیال میں حضرت زیدؓ چونکہ کاتب الوحی تھے جس طرح مصاحف ہوتی ہیں نقطے ڈالنے سے مشق ہوگئی تھی بعد میں بھی جب کہیں کوئی لفظ بے نقط لکھا پاتے تو سنت نبویؐ کے مطابق فوراً با نقط بنا دیتے تھے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ۔ اور صحابہؓ سے بڑھ کر اسوۂ رسولؐ کا زیادہ پابند کون ہو سکتا تھا؟

تابعین کی اطلاع

عبداللہ بن سلیمان بن اشعث ابن داؤد سجستانی (متوفی ۳۱۶ھ) اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ الحجاج بن یوسف غیّر فی مصحف عثمان احد عشر حرفا ..... وکانت فی یونس (۲۲) ھو الذی ینشرکم فغیّرہ یسیرکم ۔ یعنے حجاج بن یوسف نے عثمانی مصحف کے گیارہ حروف بدل دیئے مثلاً سورہ یونس کی بائیسویں آیت میں ہے کہ ینشرکم (یعنی ۔ یا ۔ نون اور شین) تو حجاج نے بدل کر یسیرکم (یعنی یا سین پھر یا) بنا دیا (کتاب المصاحف طبع مصر ۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء صہ ۴۹ و صہ ۱۱)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حجاج سے پہلے ہی نقطے ڈالنے کا رواج تھا اور حجاج اسے بخوبی سمجھتا تھا کیونکہ اگر سابقہ عثمانی مصحف میں نقطے نہ ہوتے تو اسے کس طرح پتہ چلتا کہ یہاں ینشرکم ہے اسے یسیرکم بنا دینا چاہئے ۔ بالآخر اس تشابہ کو دور کرنے کی حضرت عثمانؓ نے نقاط کے بغیر تو کوئی صورت تجویز نہیں کی ہوگی اور جب نقاط ڈالے تب ہی حجاج کا تغیر و تبدل سمجھ میں آ سکتا ہے ۔ بہرحال یہ روایت بھی اس نظریہ کی تکذیب کرتی ہے کہ حجاج ہی کے حکم سے نقطے ایجاد ہوئے ۔ وغیرہ

تاریخی شہادت

ثبوت کے لحاظ سے وہی بات پختہ اور مدلل کہی جا سکتی ہے جو دعوے کے ساتھ اپنے اندر دلیل بھی رکھتی ہو ۔ یہ بات کہ صحابہ کرامؓ نقطوں سے اچھی طرح واقف تھے اس کی تصدیق اس وثیقہ سے ہو سکتی ہے جو ۲۲ھ ہجری میں (عمر بن الخطاب (شہید ۲۳ھ / ۶۴۴ء) کے زمانے) ورق بردی پر یونانی اور عربی زبان میں لکھا گیا یہ وثیقہ متلاشیان حق و صداقت اور شیدایان تاریخ کے لئے اطمینان اور تسکین کا موجب ہے کہ اس کے بعض حروف معجم و بانقط ہیں مثلاً ۔ خاء ۔ ذال ۔ زاء ۔ شین اور نون ۔ اس وثیقہ کے عکس بمعہ تعارفی نوٹ و ترجمہ کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر گراہمن کی کتاب (FROM THE WORLD OF ISLAMIC PAPYRI, PT. II (Q) P. 82, 113, 114) ۔

اس ضمن میں قرن اول کا ایک اور نقش جو حضرت امیر معاویہؓ (متوفی ۶۰ھ / ۶۸۰ء) کے عہد میں ۵۸ھ ہجری میں لکھا

گویا تحاپین ثبوت ہے اس بات کا کہ اس وقت نقطے ڈالنے کا عام رواج تھا کیونکہ حضرت معاویہؓ کی اس تحریر پر جو کہ طائف سے برآمد ہوئی ہے واضح طور پر نقطے لگے ہوئے ہیں۔ اس کا عکس زیر نمبر ۱ ڈاکٹر جی۔ سی۔ مائلز کے مقالہ بعنوان EARLY ISLAMIC INSCRIPTIONS NEAR TAIF IN THE HIJAZ JEN S7 (1948) میں ملاحظہ ہو۔ (بحوالہ مصادر الشعر الجاہلی صفحہ ۴۲)

لغت اور اشعار جاہلیت سے استدلال

ابن السید بطلیوسی (متوفی ۵۲۱ھ) لکھتے ہیں کہ فاذا نقطتہ قلت وشمتہ وشما ونقطتہ نقطا واعجمتہ اعجاما ورقمتہ ترقیما یعنی عرب نقطہ کے لئے وشم، اعجم، نقط اور ترقیم کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ مثلاً جب کہنا ہوتا کہ وشمتہ، اعجمتہ اور رقمتہ تو اس سے مراد لیتے تھے نقطتہ یعنی یہ تینوں لفظ نقطے کے مترادف استعمال کئے جاتے تھے۔ ہوسکتا تھا کہ ابن السید بطلیوسی کی اس شہادت کو درخور اعتنا نہ سمجھا جاتا لیکن وہ اپنی تائید میں جاہلیت کے تین بڑے شاعروں ابی ذویب (متوفی ۲۷ھ) مرقش بن سعد بن مالک حمیری اور طرفہ بن العبد (مولود ۵۴۳ء مقتول ۵۶۹ء) کے ابیات کو بھی پیش کرتا ہے۔ ابو ذویب جو جاہلیت اور اسلام کا شاعر تھا کہتا ہے کہ ؎

برقم ووشم کما نمنمت بمشیمھا المزدھاۃ الھدی

یعنی حمیری کاتب نے قرضے کی میعاد والے کاغذ کی تحریر پر نقطے ڈال کر ایسا مزین بنا دیا جیسے عروس کی قیمتی ہدیہ کو سوزن کاری سے منقش بنا کر پیش کرتی ہے۔ مرقش کا بیت ہے ؎

الدار قفر والرسوم کما رقش فی ظھر الادیم قلم

یعنی خالی مکان کے نقوش و آثار ایسے نظر آرہے ہیں جیسے کسی نے ادیم (جاہلیت کا کاغذ) پر قلم سے نقطے ڈال دیئے ہوں۔ اور طرفہ کہتا ہے کہ

کسطور الرق رقشہ بالضحی مرقش یشمہ

یعنی دوپہر کے وقت کاغذ پر کسی لکھنے والے نے نقطے ڈال دیئے ہوں۔ (الاقتضاب بطلیوسی صفحہ ۹۳)

ہوسکتا تھا کہ ہم ابن السید بطلیوسی کی رائے کو عجلت اور جلد بازی پر محمول کرتے اور وشم، ترقیم اور ترقیش کو صرف حسن خط سے تعبیر کرتے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ یوسف بن سلیمان ابوالحجاج عرف الاعلم الشنتمری (متوفی ۴۷۶ھ) بھی طرفہ مذکور کے بیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ وقولہ کسطور الرق شبہ رسوم الدار بسطور الکتاب ومعنی رقشہ زینہ وحسنہ بالنقط۔ (دیوان طرفہ طبع یورپ ۱۹۰۰ء مع شرح شنتمری صفحہ ۵۲) یعنی رقش کے معنے ہیں نقطوں سے خط کو مزین و خوبصورت بنانا۔

(۱) اس کے علاوہ علامہ ابو علی اسماعیل بن القاسم بن عیذون عرف القالی البغدادی (متوفی ۳۵۶ھ/۹۶۷ء) کی تحقیق سے بھی یہی کچھ مستفاد ہوتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ رقشت الکتاب رقشا و رقشته نقطته و نقطته - میں نے کتاب کو مرقش کیا یعنی لکھا اور نقطے ڈالے (الامالی للقالی جلد ۲ صفحہ ۲۴۶ طبع مصر) اس کے بعد علامہ قالی نے بھی طرفہ کا وہی بیت پیش کیا جو ابن تابعد میں دیگر ائمہ اور اہل لسان پیش کرتے آئے۔

بانقط اور بے نقط خط کے نام

عرب جاہلیت والے خوبصورت و بانقط خط کو کئی ناموں سے یاد کرتے تھے مثلاً ترقیش، ترقیم، تنمنمہ، وشم، اور تنمیق (ملاحظہ ہو دیوان الہذلیین جلد اول صفحہ ۶۴ و صفحہ ۶۵، المؤتلف والمختلف صفحہ ۲۷ دیوان حاتم الطائی صفحہ ۲۳، دیوان سلامہ بن جندل ص ۵۱) یعنی خوبصورت خط کی علامت یہ ہوتی تھی کہ وہ بانقط ہوتا تھا۔ اور بدصورت خط کی علامت یہ ہوتی تھی کہ وہ بے نقط ہوتا تھا چنانچہ ایسے خط کو "مشق" کہتے تھے مشق کے معنے ہیں اتنی جلدی میں لکھا ہوا جس میں نقطوں کی پرواہ نہ کی گئی ہو۔ حضرت عمر بن الخطابؓ کا ارشاد ہے کہ بدترین خط "مشق" ہے (الصولی ادب الکاتب صفحہ ۵۶) ابن سیرین (متوفی سنہ ۱۱۰ھ/۷۲۸م) کہتے تھے کہ قرآن مجید خط مشق میں لکھنا مکروہ ہے جب کہا گیا کہ کراہت کی وجہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ یہ خط نقائص کا مجموعہ ہے تم دیکھتے نہیں کہ اور تو اور الف جو کہ اپنی ہیئت کے لحاظ سے نمایاں ہوتا ہے اس کا بیڑہ بھی غرق ہو جاتا ہے (المصاحف ص ۱۳۲ طبع مصر) - ابن السید بطلیوسی الاقتضاب (طبع سنہ ۱۹۰۱ء بیروت) میں لکھتے ہیں کہ انبار کے لوگ مہین اور بے نقط خط کے عادی تھے (یعنی کچہری خط لکھتے تھے) اور حیرہ والے پختہ خط (یعنی بانقط) کو پسند کرتے تھے اور بعد میں وہی خط مصاحف کے لئے منتخب ہوا اور اہل علم جلی لکھتے تھے (ص ۹۵) نیز لکھتے ہیں کہ جلدی اور کھینچ کر لکھنے میں خط کے کسی قاعدے اور قانون کا پاس نہیں رہتا جیسے خط مشق (کچہری) میں دیکھا گیا ہے۔

نقطے نہیں بھی لگائے جاتے تھے

مضمون کی ابتدا میں جن دریافت شدہ نقوش و تحریرات کی نشاندہی کی گئی ہے ان کی تصویروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ نقطے نہیں بھی ڈالتے تھے اب ذیل میں اس کی وجوہات ملاحظہ ہوں۔

(الف) یہ تحریریں اس وقت کی ہیں جب عربی زبان کو ابھی "مبین" کے امتیازی وصف سے نہیں نوازا گیا تھا اس وقت کی عربی نہ تو اتنی وسیع زبان تھی جس میں ہر موضوع پر اظہار خیال اور پھر بذریعہ تحریر اظہار ما فی الضمیر کی گنجائش نکل آتی۔ اور جب تک کوئی زبان وسعت اختیار نہیں کرتی اس کے الفاظ نہایت تھوڑے، جانے پہچانے اور محدود ہوتے ہیں۔ ایسے میں تشابہ کا اندیشہ کم رہتا تھا اور اگر رہتا بھی تھا تو اہل زبان سیاق و سباق سے لفظ کی صحیح پوزیشن اور مراد معلوم کر سکتے تھے۔

(ب) نقش نمارہ (سنہ ۳۲۸ھ) کے عکس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہایت تنگ اور گھنی سطور میں لکھنے کے عادی تھے اور ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے تھے جو اسماء، اعلام یا غیر متشابہ قسم کے ہوتے۔ ایسے میں اگر وہ نقطے ڈال دیتے تو قاری کے لئے ایک نئی الجھن یہ پیدا ہو جاتی کہ یہ نقطے کسی اوپر کے لفظ کے ہیں یا نچلی سطر کے کسی لفظ کے۔ اس نئی صعوبت سے بچنے کے لئے وہ یا تو بانقط الفاظ کا انتخاب ہی نہیں کرتے تھے اور اگر کرتے بھی تھے تو آسان قسم کا تشابہ ہوتا تھا۔ (مصادر الشعر الجاہلی صفحہ ۴۳)۔ دراصل اہل زبان کے لئے بے نقاط الفاظ کا انتخاب کرنا اتنا دشوار نہیں جتنا ہم خیال کر رہے ہیں۔ فیضی نے غیر اہل زبان ہو کر بے نقاط تفسیر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور وہ اس حد تک کامیاب رہا کہ خود اہل زبان بھی حیران رہ گئے۔ اب دیکھئے کہ ایک مقام پر اسے بڑی دشواری پیش آئی کہ یوسف علیہ السلام کے تعارف میں ابن یعقوب لکھنا تھا مگر ابن یعقوب کے تمام تر معجم و بانقط حروف تھے لہٰذا اس سے بچنے کے لئے بوجۂ فقر بے ادبی کے اس نے "ولد الاعمیٰ" لکھ دیا۔ پس جب ایک اجنبی زبان کا اہل علم کوشش کر کے بے نقاط الفاظ تلاش کر سکتا ہے تو کیا اہل زبان اس پر قادر نہیں تھے؟

(ج) ایک زمانے میں یہ رواج پڑ گیا تھا کہ بانقاط و بے نقاط تمام کلمات کو بے نقاط ہی لکھا جائے تاکہ قاری کی عقل کا امتحان ہو اور وہ اس معمہ کو خود ہی حل کرے چنانچہ یہ رواج اس قدر زور پکڑ گیا کہ عقلاء، امراء اور علماء کے باہمی مکاتبات میں اگر نقطے ڈال دیئے جاتے تو اسے صریح توہین اور دوسرے کی بے عزتی تصور کیا جاتا یعنی مرسل الیہ سمجھتا کہ مرسل نے اسے غبی یا جاہل تصور کر لیا ہے۔ تاہم اس دور میں بھی عوام کے لئے بانقط تحریر کا مخصوص بہت رواج تھا۔ اس کی پوری تفصیل امام ابوبکر صولی لغوی (متوفی سنہ ۹۴۶ء) کی ادب الکاتب طبع سلفیہ سنہ ۱۳۴۱ھ مصر صفحہ ۵۷ و ۵۸ پر ملاحظہ ہو ——— مضمون کی طوالت کے ڈر سے دو ذیلی عنوان (جاہلیت میں قلم و دوات، چاک اور کاغذوں کے نام) اور "جاہلیت والے کس کس موضوع پر لکھتے تھے"۔ ہم نے حذف کر دیئے ہیں اور قارئین کو معلوم ہو کہ اس مضمون کی انتہا بھی یہی ہے۔ والسلام

———(۰)———

رسول اللہ کی وفات کے صرف ۲۵ سال بعد مسلمانوں کی عظیم سلطنت کے دار الخلافہ مدینہ منورہ میں خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان دن دہاڑے شہید کر دیئے گئے۔　مصر کے نابینا جید عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تحقیق

الفتنۃ الکبریٰ

قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ: میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

لغات القرآن

کی تیسری جلد بھی شائع ہوگئی

فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ اس جلد میں ص سے ک تک کے تمام مادے آگئے ہیں۔ پہلی دو جلدوں کی طرح یہ بھی روشن ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ ضخامت پونے پانچ سو صفحات۔ قیمت مجلد و مطلّی۔ پندرہ روپے (علاوہ محصول ڈاک)۔ پیشگی خریداران کو بلا محصول ڈاک بھیجی جارہی ہے۔ اگر آپ پیشگی خریداران کے زمرے میں شامل نہیں تو اپنی فرمائش جلد بھیج دیجئے تاکہ آپ کو دوسرے لاٹ کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

جن حضرات نے اس عظیم کتاب کی پہلی دو جلدیں دیکھی ہیں وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ یہ صرف قرآنی الفاظ کی لغات (ڈکشنری) نہیں بلکہ قرآن کریم کی مکمل تفسیر ہے۔ اس سے قرآن کا ہر لفظ۔ اس کی ہر آیت اور اس طرح پورے کا پورا قرآن، بغیر کسی اور مدد کے، خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ اور قرآنی تعلیم کے بنیادی تصورات جن پر دین کی ساری عمارت استوار ہے، نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ اس لغات کی مثال ہمارے سارے اسلامی لٹریچر میں کہیں نہیں ملے گی۔
اس کے بعد آپ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ ہم قرآن کریم کس طرح سمجھیں۔

تین جلدیں شائع ہوچکی ہیں (قیمت فی جلد پندرہ روپے) چوتھی (اور آخری) جلد زیر طبع ہے

ملنے کا پتہ:-

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷-بی — شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

لغات القرآن

جلد اوّل ——— جلد دوم

سالہا سال کی دیدہ ریزیوں اور تفہیمی کاوشوں کا جگمگاتا شاہکار

جس کا برسوں سے انتظار تھا

قرآنی معارف و مطالب کا بصیرت افروز انسائیکلوپیڈیا

قرآن کے الفاظ ——— قرآن کے تصوّرات ——— قرآن کی تعلیم

کتاب کے حصہ اول میں عربی زبان کے مبادیات اور مفردات بھی شامل ہیں جن کی بدولت عربی زبان سے ناآشنا حضرات بھی قرآنی مفہوم و مطالب سے بخوبی مستفید ہو سکتے ہیں۔

ٹائپ کی حسین و دلآویز طباعت ——— بہتر سفید کاغذ ——— پائیدار سنہری دیدہ زیب جلد

قیمت — جلد اوّل ——— پندرہ روپے

جلد دوم (زیر ترتیب) پندرہ روپے

——— علاوہ محصول ڈاک ———

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ہند میں اسلام کا آغاز

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام (سب سے پہلے محمد بن قاسم (فاتح سندھ) کے زمانے میں آیا۔ لیکن الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد احمد صدیقی نے اپنے اس مقالہ میں بتایا ہے کہ یہ خطۂ زمین (حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلام سے روشناس ہو چکا تھا۔ ہم اس تحقیقاتی مقالہ کو (غیر متعلقہ حصے کو حذف کرنے کے بعد) ماہنامہ (ادارۂ فرقان)، لاہور (کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عربوں اور بھارت باشیوں کے تعلقات بہت قدیم ہیں۔ عرب کا انحصار ہی تجارت پر تھا اور ہندوستان قدیم تہذیب کا سرچشمہ اور قسم قسم کے تجارتی مال کی بہت بڑی منڈی تھا چنانچہ قدیم تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عرب کے تاجر کشتیوں کے ذریعہ ہندوستانی مال بنادر کے یمن کے ساحلوں سے شام جاتے جہاں سے مصر اور یورپ تک ہندوستانی مال بکثرت بکنے جایا کرتا۔ (فتوح البلدان)۔

سنہ [illegible] ق۔م۔ عرب تاجر جن کو کنعانی اور آرامی کہا جاتا ہے، ماہر جہازران تھے بحرین کے رہنے والے تھے۔ شام میں آباد ہو گئے تھے (بحیرۂ روم کے کنارے کنارے یونان پہنچتے اور وہاں سے یورپ جاتے۔ اسی طرح ایران اور ہندوستان سے ہو کر چین جایا کرتے تھے۔

سنہ [illegible] ق م یمن کی قوم سبا نے بھی ہندوستان سے تجارتی تعلقات کو مضبوط کیا تھا۔ مؤرخ جوزیفس نے لکھا ہے کہ بمبئی کے قریب سپارا مقام سے عہد سلیمانؑ میں، جن کا زمانہ سنہ ۹۵۰ ق م ہے، فلسطین سے تجارت ہوتی۔ اسی طرح ہندوستانی ململ چھینٹ اور رومال وغیرہ عرب میں مقبول تھے جن کا ذکر عربی اشعار میں ملتا ہے ان تجارتی تعلقات کے علاوہ علمی تعلقات بھی قدیم زمانے سے ہیں، چنانچہ سنہ [illegible] ق م میں عربوں نے ہندوستان

کو لکھنا سکھایا۔ خاندان موریہ (اندھرا) کے تمام کتبات آرامی یعنی عربی طرز میں لکھے ملتے ہیں جساب بھی آرامی طرز پہ لکھا جاتا ہے۔ اشوک کے کتبات بھی داہنے طرف سے لکھے ہوئے ملے ہیں۔ (اسلام کامل)

ہندوستان میں عربی بھی اسی وقت سے رائج تھی۔ حضرت مسیحؑ سے سات سو برس پہلے، جب کورو پانڈو کی لڑائی ہوئی، تو بقول سوامی دیانند جی، کوروؤں نے لاکھ کا گھر بنا کر جب پانڈوں کو جلا دینا چاہا تو ودور جی نے عربی زبان میں اس راز سے ان کو آگاہ کیا اور یدھشٹر نے بھی عربی زبان میں ان کو جواب دیا (دیکھو ستیارتھ پرکاش ذکر مہابھارت بحوالہ اسلام کامل) اور بقول فضل اللہ لطف اللہ فریدی، عرب تجار کی ایک جماعت مقام چول (CHAUL) کلیان (KALYAN) اور سپارا (SUPARA) میں مقیم ہو گئی تھی، اور اگاتھر سائڈ (AGATHUR SIDE) کے زمانہ میں مالابار ساحل پہ اتنے عرب تاجر مقیم تھے کہ ان سے متاثر ہو کر بہت سے مقامی لوگوں نے ان کا صابی مذہب (ستارہ پرستی) اختیار کر لیا۔ اسی طرح اسلام سے پہلے اہل ہند بھی عرب جایا کرتے تھے۔ چنانچہ عرب مؤرخین لکھتے ہیں کہ پانچویں صدی اور چھٹی صدی عیسوی میں ہند اور چین سے بہت سے ملاح عرب آتے تھے جن کو شہری لوگ اپنے اپنے گھروں سے دیکھتے تھے۔ تاریخ ابن جریر طبری میں مذکور ہے کہ ایک ہندوستانی بیڑا اواخر حکومت ساسانیہ میں دریائے دجلہ سے آبلہ (ABOLLA) تک داخل ہوا جو بصرہ کے قریب دجلہ اور فرات کے سنگم پر واقع ہے۔ اس طرح عرب و ہند کے تعلقات زمانہ قدیم سے ہیں۔ یہ سلسلہ ظہور اسلام کے بعد بھی قائم رہا بلکہ مستحکم ہو گیا۔ بغداد میں ایک پورا ڈیپارٹمنٹ ہندی سے عربی میں علوم اور فنون منتقل کرنے کے لئے قائم کیا گیا اور حکیم مانک چند، بجے سر، کلپ رائے، سندباد، ابن دہن اور ابن بہلہ اور گنگا وغیرہ، مشاہیر ہندی ادیب فلاسفر اس ڈیپارٹمنٹ کے انچارج اور افسر مقرر ہوئے۔ انہیں تعلقات کی وجہ سے جاٹ اور میدقومیں جو ہندو تھیں اور ایرانی فوج میں تھیں ایرانی فوج کے شکست کھاتے ہی محاسن اسلام کو دیکھ کر بخوشی مسلمان ہو کر عربوں میں مل گئیں۔ عرب و ہند کے تعلقات کی وجہ کچھ حاکمانہ جور و ستم نہ تھی، جیسا کہ بعض یورپین مؤرخین نے غلط بیانی کی ہے۔ اس لئے کہ بقول مسٹر کارلائل، ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، عثمانؓ نے کو کس جبر و ستم نے مسلمان بنایا یا حبشہ میں کیسے اسلام آیا یا چین میں کیسے اسلام پہنچا، حالانکہ کسی جنگ کا نام و نشان بھی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہند کے مسلم سلاطین کے دارالسلطنت میں تو ہمیشہ مسلمان قلیل التعداد ہی رہے۔ (مثلاً آگرہ، دہلی) بخلاف ان مقامات کے جہاں کوئی اہتمام بالشان جنگ نہ ہوئی، مثلاً کشمیر، بنگال، سندھ، ملایا وغیرہ۔ اور انہی مقامات پہ مسلمانوں کی آبادی سب سے زیادہ رہی۔

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کے اسباب و ذرائع حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اہل ہند اور عرب تجار کے درمیان قدیم تجارتی و علمی تعلق۔

(۲) مسلمانوں کا نئی نئی کالونی قائم کرنا اور ان کا ہندی عورتوں سے شادی کرنا جو انہی کے ہاتھ پر برضا و رغبت مسلمان ہو گئی تھیں۔

(۳) اعلیٰ طبقے کے ہندوؤں کا نیچے کے طبقے کے ہندوؤں کو حد درجہ ذلیل سمجھنا اور عورتوں سے وحشیانہ برتاؤ کرنا۔ لہٰذا ان لوگوں نے جب مسلمانوں کے اخلاق حمیدہ، اخوت و مساوات، عدل و انصاف، سچائی اور خدا پرستی کو دیکھا تو اضطراری طور سے اسلام کی طرف مائل ہو گئے۔

(۴) یہاں کے فقراء و مساکین کا تجار کے سایہ میں آنا۔

(۵) بعض ہندو راجاؤں کا اسلام قبول کرنا۔

(۶) فقراء اور مساکین کا اپنی اولاد کو تجار کے ہاتھ فروخت کرنا جن کی یہ تجار اپنی اولاد کی طرح پرورش کرتے تھے

(۷) بت پرستوں کا معجزات اسلام اور کرامات اولیاء اپنی نظر سے دیکھنا (تفصیل کے لئے دیکھئے عرب و ہند کے تعلقات سلیمان ندوی اور آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام وغیرہ وغیرہ)

یہ اسباب تھے جو اُن کو اسلام کی طرف مائل کرتے چلے جاتے تھے لیکن چونکہ یہ بحث میرے مبحث سے خارج ہے اس لئے اس کی تفصیل کو نظر انداز کرتا ہوں۔ بہر حال اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ہی، یعنی پہلی صدی ہجری کے ابتدائی اور اوسط زمانوں ہی میں، ہندوستان میں مسلمان نظر آنے لگے۔ سراندیپ کا راجہ ۴۲ھ میں مسلمان ہو گیا تھا۔ (سلیمان ندوی بسند تاریخ فرشتہ) ملابار کا راجہ بھی مسلمان ہو گیا تھا۔ راجہ داہر کے یہاں پانسو کے قریب علافی مسلمانوں نے پناہ گزین ہو کر، داہر کی موافقت میں راجہ رمل سے جنگ کر کے داہر کی محبت حاصل کر لی تھی۔ عراق سے بعض ہاشمی بھاگ کر ملابار میں مقیم ہو گئے۔ جن کی اولاد موپلا کہلاتی ہے۔ کچھ راس کموری پہ مقیم ہو گئے اور لبی کہلائے۔ اور کچھ کونکن پہ مقیم ہو گئے اور نوائط کہلائے۔ مسٹر کارڈویل (CARDUELL) نے ۱۱۱ھ کے مسلمانوں کے سکے ملابار میں برآمد کئے۔ (تارا چند)۔ اس کے علاوہ (بسند فتوح البلدان علامہ بلاذری) سراندیپ میں جو مسلمان تاجر مقیم ہو چکے تھے، ان کے کمپ کے بعد ان کی بیویوں اور لڑکیوں کو وہاں کے راجہ کا جہاز پر عراق بھیجنا، یہ سب صاف بتلاتے ہیں کہ یہاں لوگوں کا خیال تھا کہ صرف مسلمانوں کی محبت کی وجہ سے ان کے راجاؤں کی عمریں اتنی لمبی ہوتی ہیں۔ زمورن کے راجہ نے ہر ملاح کے خاندان کو حکم دے دیا تھا کہ ان کے یہاں ایک آدمی خود مسلمان کی طرح پرورش کیا جائے۔ (تبلیغ اسلام آرنلڈ) کالی کٹ اور ملابار کے راجاؤں نے نو مسلموں کے لئے قاضی مقرر کر دیئے تھے جن کو ہنرمند کہتے تھے (عجائب الہند[1])۔ بہر حال اب دیکھنا یہ ہے کہ اہل ہند کو اسلام سے

[1] مسعودی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ ۳۰۴ھ میں زیمور کے راجہ سے ملا، وہاں ان مسلمانوں کی تعداد جن کو (باقی اگلے صفحہ پر)

سب سے پہلے کس نے روشناس کیا؟

ظہورِ اسلام کے بعد مسلمان عرب تین مختلف راستے سے ہندوستان آئے۔ (۱) بحری راستہ (۲) درۂ خیبر سے (۳) بری راستہ سے۔ سب سے پہلے ہم بحری راستہ سے آنے والے تجارِ عرب کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور سے ریستارعرب جزائرنہبردان) ان بندرگاہوں سے سندھ آتے تھے جو خلیج فارس پر تھے مثلاً سیراف۔ بصرہ وغیرہ۔ وہاں سے کنارے کنارے کوکن، گجرات ہوتے ہوئے مدراس کے ساحل پر آتے اور یہاں سے کچھ لوگ بنگال ہوتے ہوئے چین آسام چلے جاتے اور کچھ لوگ مالدیپ لنکا دیپ چلے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہی مقامات اسلامی مراکز بن گئے۔ اور (بقول ہندی مؤرخ ڈاکٹر تاراچند) یہ تجارِ عرب ہند میں بحرِ احمر کے راستے سے یا سواحلِ جنوبیہ سے آتے اور ان کا مطمحِ نظر بحرِ سندھ کا دہانہ تا خلیج کھمبی یا مالابار کے کنارے ہوتے تھے۔ اس سے پھر کولم یا دوسرے بندرگاہ چلے جاتے تھے اور جو کشتیاں خلیج فارس سے آتیں وہ بھی کولم یا مالابار چلی جاتیں چنانچہ اکثر مؤرخین کا خیال ہے کہ یہی تجارِ عرب ہند میں اسلام کے پہلے مبلغ ہیں اور انہی کے ذریعہ اسلام سب سے پہلے ہندوستان کے علاقہ مالابار میں آیا۔

(اس کے بعد، مقالہ نگار نے دو ایک ایسی روایات لکھی ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام خود عہدِ نبویؐ میں آگیا تھا لیکن اس کے بعد خود ہی ان روایات کو غیر یقینی قرار دے کر مسترد کر دیا ہے۔ اس لئے ہم انہیں درج کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں)

میرا ذاتی خیال ان حضرات کے ساتھ ہے جنہوں نے راجہ مالابار کے اسلام لانے کا زمانہ عہدِ نبویؐ نہیں مانا ہے اور وہ اس لئے کہ جس زمانہ میں اسلام مکہ میں ظاہر ہوا تو جو حضرات دوسرے شہروں سے اطاعتِ اسلام کرنے آئے ان کا ذکر قرآن کریم نے کیا یا روایاتِ صحابہؓ میں۔ جیسے سات آدمی جو قوم نجاشی کے تھے اور حبشہ سے نبیؐ کے پاس آئے ان کا ذکر قرآن میں یوں ہے "وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اٰلآیہ"۔ اور سلمان فارسیؓ کا قصہ صحابہؓ بہت روا کرتے ہیں۔ اگر نبی کریمؐ کے زمانہ میں مالابار کا راجہ آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے ہندوستان سے مکہ جاتا تو صحابہؓ اس اہتمم بالشان واقعہ کا ضرور ذکر کرتے کیونکہ یہ ایک جلیل القدر ہندوستان کا راجہ تھا۔ اس کا اسلام کے لئے مکہ جانا ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان اور چین میں لوگوں کا اعتقاد تھا کہ دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ چار ہیں اور ان میں سب سے بڑا شاہ عرب ہے۔ (خلیفہ بغداد) دوسرا چین کا خاقان۔ تیسرا قیصرِ روم اور چوتھا ہندوستان کا راجہ بلہرا۔ تو ظاہر ہے کہ ہند کے راجگان میں کسی کا عرب اسلام

(حاشیہ سابق صفحہ) "جیسے کہتے تھے دس ہزار تھی۔ یہ لوگ بصرہ، سیراف، عمان، بغداد سے آئے یہیں متوطن ہو گئے پھر سلسلہ مناکحت بھی قائم ہوا اس میں بڑے مشہور تاجر تھے۔ مثلاً موسیٰ بن اسحاق، ابو سعید ابن زکریا وغیرہ"

کے لئے جانا کتنا اہتمام بالشان واقعہ ہو سکتا ہے جو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور مسلم تجار کے متعلق یہ کہنا، جیسا کہ اکثر مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ لوگ اولین مبلغ اسلام ہیں، تاریخی حیثیت سے مستند نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ ان کے ابتداءً آنے کی صحیح تاریخ کا ثبوت نہیں، اور جو ملتا ہے ان سے پہلے مسلمان آ چکے تھے۔ اگر یہ تجار خلافت عمرؓ سے پہلے آئے تو ہرگز صحیح نہیں۔ اس لئے کہ صحابہؓ عہد نبویؐ میں مکہ سے نکل نہیں سکتے تھے اور صرف حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ پھر مدینہ کی طرف۔ پھر ان کو عرب سے باہر ہندوستان آنے کا امکان کہاں، قریش کی جنگ کی وجہ سے اور دوسرے قبائل کے عناد کی وجہ سے اور غزوات میں مشغولیت کی وجہ سے اور ان کا آنا ابوبکرؓ کے خلافت کے زمانہ میں بھی ممکن نہ تھا، فتنہ ارتداد اور مختلف غزوات کی وجہ سے۔ اگر یہ لوگ عہد نبویؐ میں تبلیغ اسلام کے لئے ہند کلیچ گئے ہوتے تو ضرور ان کا ذکر صحابہ کرامؓ کرتے۔ لہٰذا مبلغ اسلام اولاً یہ تجار نہیں ہو سکتے۔ ہاں یہ لوگ ناشرین اسلام کہے جا سکتے ہیں۔

دوسرے مؤرخین کی جماعت، مثلاً بزرگ شہریار نے، عجائب الہند میں لکھا کہ اسلام سب سے پہلے سرندیپ میں آیا اور ملابار میں اس کے بعد پہنچا۔ سرندیپ کے لوگ بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ جب یہاں کے راجہ نے نبی کریمؐ کی بعثت کا حال سنا تو اس نے ایک عاقل آدمی کو تحقیق کے لئے عرب بھیجا یہ حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے نبی کریمؐ اور ابوبکرؓ صدیقؓ کے حالات بتائے۔ وہ یہ سن کر واپس چلے تو مکران میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے ساتھ ایک غلام تھا۔ وہ صحیح سلامت واپس آ گیا۔ اس نے سب حال بتایا یہاں کے بدھ مذہب والے راجہ متاثر ہوئے اور مسلمانوں سے حد درجہ کی محبت ان کو ہو گئی۔ اس طرح اس غلام نے صحیح معنوں میں یہاں اسلام کی تبلیغ کی۔ یہاں بھی راجہ کو اسلام کی خبر پہنچانے والے تاجر نہیں ہو سکتے کیونکہ عہد عمرؓ سے پہلے تاجر کا عرب سے اسلام کا پرچار کرنے کے لئے آنا ثابت نہیں مسٹر رولینڈسن (ROWLANDSON) فرماتے ہیں مسلم عرب پہلے پہل ساحل ملابار میں مقیم ہوئے، ساتویں صدی کے اخیر میں۔ فرانسس ڈے (FRNCIS DAY) اس کی تائید کرتے ہیں۔ اور مسٹر اسٹرک (STRUCK) نے جہاں موپلا کا ذکر کیا ہے وہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ عرب مؤرخین بھی اس کے موید ہیں۔ اور یہ زمانہ حضرت عمرؓ کے بعد کا زمانہ ہے۔ لہٰذا حضرت عمرؓ کے زمانے کے اسلام کی تبلیغ کرنے والوں کو شرف اولیت حاصل ہوگا۔ نہ کہ ان تجار کو۔ یہاں پر راجہ نے یا تو یہود و نصاریٰ سے سنا، یا جو کہ زیادہ قرین قیاس ہے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں صحابہ کرامؓ نے یہاں اسلام کی جو تبلیغ کی، اس کی خبر ان لوگوں کو پہنچی۔ تو پھر یہاں ہند میں یا اہل ہند کو سب سے پہلے کس نے اسلام سے روشناس کیا۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

دوسرا راستہ جہاں سے مسلمان آئے وہ درہ خیبر تھا۔ اس راستہ سے ۴۴ھ میں، مہلب بن ابی صفرہ سب

سے پہلے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تو مکران (قلات) تک آ گئے۔ مال غنیمت میں جو گھوڑے تھے ان کے ایال کٹے ہوئے تھے، ان کو پسند آئے۔ حکم دیا کہ لشکر کے گھوڑے اسی طرح کر دیئے جائیں کیونکہ اس زمانے میں عرب والے ایال نہ کاٹتے تھے۔

تیسرا راستہ جدھر سے مسلمان آئے وہ بحری راستہ تھا۔ اس راستہ سے بلوچستان ہوتے ہوئے مکران اور سندھ میں آئے۔ مکران پر اسلام سے پہلے راجہ چچ ہندی راجہ کا قبضہ تھا جو حدود سندھ میں داخل تھا۔ فارس اور سندھ کی پٹی اور بحری حدود ملی ہوئی ہیں۔ لہٰذا سندھی قومیں فارس کی فوج میں کام کرتی تھیں، جن میں تین سندھی قوموں کا نام تاریخ میں ملتا ہے۔ (۱) اساورہ - (۲) سیابجہ - (۳) جاٹ۔ بہرحال سب سے پہلے انہی قوموں میں اسلام آیا۔ جاٹ قوم کی صورت شکل کے آدمی کو حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ (متوفی ۳۲ھ) نے کوفہ میں دیکھ کر فرمایا "کانہم زط" یہ قومیں فارس کے بادشاہ یزدجرد کی فوج میں تھیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ قائد لشکر تھے۔ فارسیوں کی جنگ میں اسی جنگ میں اشعریؓ نے بہ مشورہ عمرؓ اساورہ قوموں کی شرائط مان لیں۔ یہ لوگ مسلمانوں سے مل گئے اور فوراً بعد سیابجہ بھی مسلمان ہو گئے۔ اور عرب قبائل کے ساتھ عراق میں مقیم ہو گئے۔ یہ سندھی قوم کا اسلام میں داخل ہونے کا پہلا موقع تھا۔ پھر بہت سے سواحل کے لوگ مسلمان ہوئے۔ حضرت علیؓ نے جاٹوں کو بصرہ میں حاکم خزانہ بنایا (طبری) بصرہ کی فوج کا قائد، ابو سلمہ، جاٹ قوم کا تھا۔ امیر معاویہؓ جاٹوں کو عراق سے شام لے گئے تاکہ روم کے مقابلہ میں اسلام کی جانب سے لڑیں، پھر عبد الملک نے انطاکیہ میں انہیں بسایا۔ انہیں "زطوں" میں سے ہمارے امام اعظم ابو حنیفہؒ پیدا ہوئے جو اسلام کے لئے باعث فخر ہیں۔ یہ بہترین مثال دنیا کے سامنے اسلامی اخوت و مساوات و عدل و انصاف کی ہے کہ ایک "زط" اسلامی دنیا میں اتنا وقیع مرتبہ حاصل کرتا ہے کہ اس کا لقب امام اعظم ہو جاتا ہے۔ ان کی پیدائش ۸۰ھ میں ہوئی۔ اس سے پتہ چلا یہ قوم، فتح سندھ کے بہت پہلے اسلام لائی اور عمرؓ کے زمانہ میں اسلام لائی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کی یہ قوم حضرت عمرؓ کے ہی زمانے میں مسلمان ہو گئی تھی۔

اور یہ ہرگز ممکن نہ تھا، بالخصوص حضرت عمرؓ کے زمانے میں، کہ حضرت اشعریؓ کسی قوم سے بھی بغیر اسلام پیش کئے جنگ لڑتے ہوں گے کیونکہ یہ اسلامی اصول ہے کہ پہلے اسلام پیش کیا جائے، پھر جزیہ طلب کیا جائے، اس کے بعد جنگ کی جائے۔ نہ اسی وجہ سے ایران کے آتش کدے بعد قبول جزیہ محفوظ رہے۔ عیسائیوں کے کنائس مامون رہے۔ کسی نے مزاحمت نہ کی۔ یورپین مورخین (آرنلڈ وغیرہ) سب شاہد ہیں۔ نیز ہندی مورخ تاراچند مجمل الفاظ میں اپنی کتاب میں اس کی تائید کرتے ہیں۔ تو بھلا اس جنگ میں اسلام نہ پیش کیا گیا ہوگا؟ اور پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں، اور ایسے جلیل القدر صحابی سے اصول اسلام سے تجاوز ناممکن تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ان جاٹ قوموں میں اسلام کا تعارف بطریق احسن ہوا۔ جو ایمان لائے وہ تو مسلمان ہوئے۔ جو نہ لائے وہ بھی اسلام سے خوب

واقف ہوگئے جس کا چرچا ہندوستان کے راجاؤں میں ہوتا رہتا تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے اہلِ ہند کی اساورہ اور جاٹ قوموں میں اسلام کے تعارف کا شرف، بالیقین انہی صحابیٔ رسولؐ، ابوموسیٰ اشعریؓ کو حاصل ہے۔ ان سے پہلے کسی مسلم تاجر کا ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کرنا ثابت نہیں۔ بلکہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں لکھا ہے کہ مسلم تجارِ عرب کے، ہندوستان میں ابتداءً آنے کی تاریخ صحیح طور پر معلوم نہیں ہے۔ ہاں تجارِ عرب اور صوفیائے عجم و عرب یقیناً اسلام کے ترقی دینے والے تھے اور اشاعتِ اسلام میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے لیکن ہم اس تفصیل کو، چونکہ ہمارے مبحث سے خارج ہے، نظر انداز کرتے ہیں۔

اب اخیر صحابہ کرامؓ کا ہندوستان پر حملہ کرنا قابلِ ذکر ہے جس پر اکثر یورپین مورخین اور مورخین عرب و ہند کا اتفاق ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں سنہ ۱۵ھ میں بحرین کے حاکم حضرت عثمان ابن ابی العاص ثقفیؓ نے اپنے چھوٹے بھائی حکم بن ابی العاص (ثقفیؓ) کو ہندوستان پر فوج کشی کا حکم دیا۔ حکمؓ کا شمار صحابہ کرام میں تھا (اسدالغابہ)۔ آپ ایک جماعت کو ساتھ لے کر ہندوستان کی جانب چلے۔ اعلائے کلمۃ اللہ کے نشہ اور تبلیغِ دینِ متین کی لگن نے دشوار گذار راستوں کو آسان کر دیا اور آپ کی جماعت نے جیسے ہی سمندری راستہ طے کر کے خشکی کے راستہ منزلِ مقصود کو سامنے دیکھا تو خوشی میں "اللہ اکبر" کے نعروں سے ہندوستان کی زمین گونج اٹھی۔ یہ اس سرزمین میں سب سے پہلی ایمانی گونج اور سب سے پہلی توحیدِ حقیقی کی پکار تھی (صحیفہ گجرات)۔ تھانہ کو حضرت حکمؓ نے دعوت و تبلیغ کے لئے نامزد فرمایا۔ مگر حکمرانوں نے سخت مخالفت کی۔ بہرحال آپ نے اصولِ اسلام کے مطابق، اصولِ تبلیغ پیش کئے۔ مگر کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو اتمامِ حجت کے بعد حملہ کر دیا۔ اور نہایت شاندار فتح حاصل ہوئی۔ سرزمینِ ہند پر یہ سب سے پہلا مسلم حملہ اور سب سے پہلی فتح تھی (فتوح البلدان بلاذری)۔ اس میں بہت سے صحابہ کرامؓ کو مرتبۂ شہادت بھی نصیب ہوا۔ جو بھروچ اور بمبئی کے درمیان مدفون ہیں۔ کچھ عرصہ تک حضرت حکمؓ اور صحابہ کرامؓ اور دیگر مسلمانوں کی جماعت یہاں مقیم رہی جس سے خیر و برکت کا چشمہ ابل پڑا کتنے ہی لوگ نورِ اسلام سے منور ہوگئے۔ کفر و شرک کی تاریکی سے نکل کر مسلمان ہوگئے (صحیفہ گجرات)۔ اسی زمانہ میں حضرت مغیرہ بن ابی العاص ثقفیؓ نے دیبل پر حملہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ پھر صحابہ کرام نے بھڑاچ پر حملہ کیا اور کامیاب ہوئے (صحیفہ گجرات) اور دعوت و تبلیغ کا اثر نمایاں طور پر ظاہر ہو کر رہا۔ اور توحید کے نغموں سے احجار و اشجار تک مانوس ہوگئے۔

پھر چند مصالح کی وجہ سے صحابہ کرامؓ واپس چلے گئے۔ یہ ناقابلِ انکار تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ حبیش ثقفیؓ نے سب سے پہلے ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کی۔ ماحصل یہ کہ سب سے پہلے ہندوستان میں اسلام کا تعارف کرانے والے صحابہ کرامؓ تھے اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں، جن میں (۱) حبیش ثقفیؓ کے نام حضرت حکمؓ کو شرفِ اولیت و تقدم حاصل ہے جنہیں سنہ ۱۵ھ میں تھانہ پر حملہ کر کے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا آغاز!

(۲) اور حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ میں آپ دوسرے صحابی جنہوں نے ہندوستانی جاٹ قوم کو مسلمان کیا، جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، ان کو بھی حسینؓ ثقفیؓ کی طرح اولیت کا شرف حاصل ہے۔ وہ ہیں حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

(۱) کوئی صاحب یہ کہیں ابوموسیٰ اشعریؓ ہندوستان کبھی نہ آئے بلکہ یزدجرد کی فوج میں ہندوستانی جاٹ قوم کو مسلمان کیا۔ اس لئے اگرچہ انہوں نے بعض اہل ہند کو مسلمان بنایا مگر دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان کے اطراف میں آ کر کس نے سب سے پہلے اسلام کا پیغام پہنچایا جس کی تاریخی شہادت موجود ہو، تو ربیع بن زیاد جنہوں نے اشعریؓ کے حکم سے مکران پر قبضہ کر لیا تھا، اور ابن عامر اور حکم تغلبی جس نے ۲۳ھ میں راجہ مکران کو جو سندھ کے راجہ کی مدد سے لڑ رہا تھا، قتل کر دیا تھا۔ ان حضرات کو ہم چھوڑتے اور نظر انداز کرتے ہیں۔

(۳) تیسرے صحابی کو پیش کرتے ہیں جس کا نام ہے عبدالرحمٰن بن سمرہؓ۔ جو زرنج اور کش تک گئے خلافت عثمانیہ میں اس کو فتح کر لیا۔ یہ مقامات اس وقت ہند کی حکومت میں تھے۔ پھر رخج اور داوران پر حملہ کیا۔ اہل داوَن جبل زور پر پناہ گزین ہوئے۔ اس پہاڑ پر ایک بُت تھا جس کا نام زور تھا اور جس کی وجہ سے وہ جبل زور کہلاتا تھا۔ اس بُت کی آنکھیں نکلوالیں جو یاقوت کی تھیں، اور اس کے دونوں بازو توڑ دیئے جو سونے کے تھے۔ اور اس مقام کے حکام کو جو ان واقعات کو دیکھ رہے تھے بلا کر کہا کہ زر و یاقوت کو لے جاؤ، ہم کو اس کی ضرورت نہیں۔ یہ کام ہم نے صرف اس لئے کیا کہ تم لوگوں کو دکھا دیں کہ یہ صرف بُت ہے، اس میں کوئی طاقت ضرر رسانی یا نفع بخشی کی نہیں ہے۔ یہ تو بالکل اسلام کا تعارف کراتا ہے اور ناقابل انکار تاریخی واقعہ ہے۔ اس لحاظ سے بھی اس اطراف میں سب سے پہلے معروف اسلام صحابی ـــــ عبدالرحمٰن بن سمرہؓ ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے سب سے پہلے اسلام کی تبلیغ کی تو ضرور۔ مگر یہ ثابت نہ ہو سکا کہ ان کی تبلیغ سے کوئی مسلمان بھی ہوا

تو ہم :-

(۴) ثاغر بن دعور اور حارث بن امرہ کو پیش کرتے ہیں۔ یہ عہد معتصمؒ (یعنی ۲۳۰ھ میں) حملہ آور ہوئے (البیہقی۔ ابن اثیر) اور اسلام کی فتح و نصرت کا یہ واقعہ رونما ہوا کہ مجاہدین نے لڑتے وقت ایک نعرہ اللہ اکبر کا اس زور سے لگایا کہ دیبانی لوگ تھرا گئے۔ کچھ لوگ بھاگ گئے کچھ مشرف با اسلام ہوئے (ELLIOT بسند چچ نامہ، تحفۃ الکرام)

اس لحاظ سے اس اطراف میں سب سے پہلے مسلمان بنانے والے یہ ہیں۔ یہ سارے واقعات محمد بن قاسم کے سندھ فتح کرنے سے بہت پہلے کے ہیں، حالانکہ بقول کرنل ٹاڈ (TOD) و (ELLIOT) اور (بسند فتوح البلدان علامہ بلاذری) سندھ حضرت علیؓ ہی کے زمانہ میں فتح ہو چکا تھا لیکن ان کی وفات کی خبر سن کر مسلمان واپس ہو گئے۔ ان واقعات کے بہت زمانے بعد محمد بن قاسم آئے اور پھر مسلمانوں کے حملے ہوتے رہے

اور ساتھ ساتھ دعوت و تبلیغ کی برابر کوشش ہوتی رہی۔ عرب کے تاجروں نے بھی تبلیغ کی اور صوفیائے عرب و عجم نے بھی اسلام کو خوب پھیلایا۔ جن کی تفصیل کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں۔ بہرحال سب سے پہلے اسلام کا تعارف اہلِ ہند سے کرانے والے اکثر صحابہ کرامؓ ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:

سب سے پہلے مبلغ اسلام فی الہند

(۱) جیش ثقفیؓ یعنی حضرت حکمؓ بن العاص ثقفی۔ (مغیرہ بن العاص ثقفی سنہ ۱۵ھ اور ان کی جماعت نے بزمانہ حضرت عمرؓ بمبئی میں تھانہ میں لوگوں کو مسلمان کیا۔ پھر بھراچ و دیبل کے اشجار و احجار تک توحید کے نغموں سے مانوس ہوگئے۔ ان کے بعد

(۲) ابوموسیٰ اشعریؓ نے تقریباً سنہ ۱۷ھ بزمانہ حضرت عمرؓ ہندوستانی فوج اساورہ اور سیابجہ کو مسلمان کیا۔ ان کے بعد

(۳) عبدالرحمٰن بن سمرہؓ۔ تقریباً سنہ ۲۹ تا ۳۱ھ بزمانہ حضرت عثمانؓ۔ زرنج اور کش کے درمیان علاقہ پر قابض ہوئے۔ پھر زرنج اور روادن پر قبضہ کیا اور تبلیغ کی (اور زنجیت کا قصہ)۔ ان کے بعد

(۴) شاغر بن دعور (بسند البیت و ابوظفر ندوی) یا حارث بن مرہ (بسند فتوح البلدان بلاذری) سنہ ۳۸ھ بزمانہ حضرت علیؓ کوہستان قیقان پر۔ (نعرۂ اللہ اکبر کا قصہ) بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے۔[۱]

---

[۱] مورخ مسعودی کی کتاب مروج الذہب ج ۳ صفحہ ۱ میں حسبِ ذیل لکھا ہے۔ جنگ قادسیہ کے بعد سنہ ۱۶ھ میں عتبہؓ کو حضرت عمرؓ نے ہند کا گورنر بنایا اور کہا شیاں رکھتا یہ کفار کا ملک ہے۔ اسی زمانہ میں ایک فلسفی سے ہند کا حال حضرت عمرؓ نے پوچھا تو جواب ملا کہ کافر کا ملک ہے۔ مگر یہ کہیں سے پتہ نہیں چلتا کہ یہ ہندوستان آئے۔ اس وجہ سے میں نے ان کا اس مقالہ میں ذکر نہیں کیا۔

علامہ احمد امین مصری مرحوم، کی علمی و تاریخی کاوشوں کا شاہکار اور اسلام کی سرگذشت کے سلسلۂ دراز کی پہلی کڑی

فجر الاسلام

(جسے مولانا عمر احمد صاحب عثمانی نے اردو زبان کا لباس پہنایا) ضخامت ۴۰۰ صفحات قیمت آٹھ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

نقد و نظر

نظام الملک طوسی تاریخ و تحقیق کے میدان میں مولانا عبد الرزاق کانپوری کا نام ہماری جدید پود کے لئے شاید محتاج تعارف ہو۔ لیکن آج سے ذرا پہلے کے علم دوست طبقہ میں سے کون "البرامکہ" کے مصنف سے واقف نہیں تھا۔ "نظام الملک طوسی" مولانا مرحوم کی تحقیقی کاوشوں کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسے نفیس اکیڈیمی کراچی نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ اپنے نام کی مناسبت سے بظاہر یہ کتاب دولت سلجوقیہ کے ایک وزیر اعظم خواجہ حسن نظام الملک طوسی کی سوانح حیات سمجھی جائے گی لیکن دراصل یہ دور سلجوقیہ کے پورے مدوجزر کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ بالخصوص نظام الملک کے معاصرین میں سے حکیم عمر خیام اور خدائی تحریک کے بانی شیخ الجبال حسن بن صباح کی صلاحیتوں اور "کارناموں" کو جس تفصیل سے پیش کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ باطنی فرقوں اور ان کے انوکھے عقائد کو جس شرح و بسط سے منظر عام پر لایا گیا ہے وہ اس کتاب کی اصل خوبی ہے۔ ہمارے نزدیک نظام الملک کی حیثیت اپنے عہد کے ایک سیاست دان اور وزیر اعظم سے زیادہ نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے لاتعداد مشاہیر نظر آئیں گے اور اس لحاظ سے اس کا تذکرہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن حسن بن صباح کی پراسرار اور خوف انگیز شخصیت اور باطنی فرقوں کی تفصیل سے اس کتاب نے اردو لٹریچر میں قابل قدر سرمایہ کا اضافہ کیا ہے۔

عمر خیام کو بھی ہمارے ہاں عام طور پر ایک رند مشرب شاعر سے زیادہ تعارف حاصل نہیں لیکن درحقیقت وہ فلسفہ و حکمت، منطق، ریاضی اور نجوم کا بہت بڑا عالم تھا۔ اور اس کی یہی وہ حیثیت ہے جسے اس کتاب میں نمایاں کیا گیا ہے۔

ہمیں یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ اکیڈیمی اس کے بعد "البرامکہ" کی از سر نو اشاعت کا بھی اہتمام کر رہی ہے۔ وہ کتاب بھی ایک عرصہ سے نایاب تھی اور اس کی اشاعت اس کمی کو پورا کر دے گی۔

زیر نظر کتاب بڑے سائز کے ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد بارہ روپے۔ چرمی جلد سولہ روپے۔

تفسیر الیوبی

ہماری حتی المقدور کوشش یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم کے متعلق کہیں کچھ شائع ہو، اسے ایک نظر ضرور دیکھ لیا جائے۔ اسی جذبۂ شوق کے ماتحت ہم نے زیرِ نظر تفسیر کو بھی اٹھایا۔ یہ اعوذ باللہ، بسم اللہ اور سورہ فاتحہ کی جامع تفسیر" علامہ محمد ایوب صاحب دہلوی کی تصنیف ہے جس کے متعلق پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "علامہ محترم نے اپنے ان مقالات میں ایسے ایسے تفسیری گوشوں پر نظر ڈالی ہے اور اعلیٰ مطالب کی طرف ایسے ایسے لطیف اشارات فرمائے ہیں کہ تھوڑے سے غور و فکر سے ذہن دولتِ علم سے مالا مال ہو جاتا ہے۔" ہم نہیں چاہتے کہ قارئین طلوع اسلام اس "دولتِ علم" سے یکسر محروم رہ جائیں۔ اس لئے ہم اس اعلیٰ مطالب کے گنجِ گراں مایہ سے دو ایک جواہر پارے ان کے سامنے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:-

(۱) بسم اللہ کی تفسیر میں ارشاد ہے:-

"ایک روایت میں آیا ہے کہ تمام آسمانی کتابوں میں جو مضامین ہدایت ہیں وہ سب کے سب ان چاروں یعنی توریت اور زبور۔ انجیل اور قرآن میں ہیں۔ اور ان چاروں میں جو مضامین ہیں وہ تمام کے تمام قرآن شریف میں ہیں۔ اور قرآن شریف کے مضامین سورۂ فاتحہ میں ہیں۔ اور سورۂ فاتحہ کے مضامین بسم اللہ میں ہیں۔ اور بسم اللہ کے مضامین ب میں ہیں۔ اور یہ حق ہے اس لئے کہ ب کے معنی الصاق کے ہیں یعنی متصل ہونے اور چمٹنے کے ہیں۔ یعنی مقصد تمام تعلیمات اور ہدایات کا صرف یہی ہے کہ بندہ اپنے رب سے متصل ہو جائے۔

اب اس بات کا بیان کہ کائنات اور موجودات میں سے ہر شئی ہر وجود ہر کائن کی ابتدا اللہ ہی کے نام سے ہے۔ یہ ہے کہ ابتدا حقیقتاً اس کائنات میں موجود نہیں ہے یعنی حقیقی ابتدا اور حقیقی قبلیت اور حقیقی شروع وہ ابتدا ہو گی جس کے لئے ابتدا اور قبلیت نہ ہو اور یہاں ہر قبلیت سے قبل اور ہر ابتدا سے پہلے ابتدا موجود ہے، اور متحقق ہے کیونکہ ہر حادث سے قبل حادث یا عدمِ حادث موجود ہے متحقق ہے یعنی ابتداؤں کا سلسلہ لانہایت جارہا ہے اور کوئی ایسی ابتدا نہیں ملتی جس کے لئے ابتدا نہ ہو، اور سلسلۂ ابتدا آت لامتناہیہ فرضیہ سے یا ہر سلسلۂ لا ابتدا ہے، فرضیہ کی قید اس لئے لگائی ہے کہ واقعیہ لامتناہیہ باطل ہے، لیکن جس دن زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اس سے پہلے اور اس سے پہلے، اور اس سے پہلے اور اسی لا انتہا پہل کے مراتب پر اللہ تعالیٰ سوا آنے کُل کلاں قادر ہے اس لئے سلسلہ کو مفروضہ اور فرضیہ ہم نے کہا ہے اور اس سلسلہ ابتدا آت میں لا ابتدا ماضی کی جانب میں داخل نہیں ہے، جیسا کہ اب تک علماء اور حکماء گمان کرتے آئے ہیں یعنی ابتداؤں کا سلسلہ لا ابتدا پر نہیں ٹھہرتا، یعنی ماضی کی جانب میں لا ابتدا ہو اور پھر سلسلۂ ابتدا آت ہو، ایسا نہیں ہے اس لئے لا ابتدا لا انتہا ہے اور اب ماضی کا حصہ گزرنے کے بعد ابتدائیت شروع ہونے کی تقدیر پر لا ابتدا منقطع ہوگا جب ہی تو ابتدا آت شروع ہوں گے، اس لئے لا ابتدا

اس سلسلۂ ابتدائیت کا اوّل نہیں ہے کیونکہ لا ابتدا لا اوّلی ہے، اور لا اوّل سلسلۂ اوّلیات کا اوّل اسی لائن اوّلیات میں ہو نہیں سکتا کیونکہ اس وقت لا اوّل سے اوّل کو ربطِ حقیقی ہو جائے گا، اور لا اوّل مثل ان اوّلیات کے اوّل ہو جائے گا یعنی لا اوّل منقطع ہو کر اس سلسلۂ اوّلیات کا اوّل ہو جائے گا، اور لا اوّل کا اوّل ہونا محال ہے، لہٰذا لا اوّل اس سلسلۂ اوّلیات سے باہر ہے اور اس سلسلۂ اوّلیات کو محیط ہے خواہ یہ سلسلۂ کائنات موجود ہوں یا معدوم ہو، خواہ متناہی ہوں خواہ غیر متناہی، فرضی ہوں یا حقیقی، ہر صورت میں لا اوّل اوّل کو گھیرے ہوئے ہے۔ اب اگر تو یہ کہے کہ جب اوّل اول کو گھیرے ہوئے ہے تو سلسلۂ اوّلیات محدود اور متناہی ہو گیا اور سلسلۂ ہدایات کے لئے انقطاع اور آخر ثابت ہو گیا، نیز سلسلۂ معلوماتِ باری تعالیٰ سوائے باری تعالیٰ کے یعنی وہ سلسلۂ معلوماتِ باری تعالیٰ جس میں خود باری تعالیٰ شامل نہیں ہے وہ قطعی غیر متناہی ہے، اور وہ معلومات محاط یعنی گھیرے ہوئے ہونے کی تقدیر پر محدود اور متناہی ہو گئے"

"بسم اللہ" کا مفہوم تو آپ نے سمجھ لیا۔ اب "رب العالمین" کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے۔

"رب کے معنی پیدا کرنے کے بعد باقی رکھنے والے کے ہیں جو پیدا کرے اور پھر اس موجود کو باقی رکھے اسی کو رب کہتے ہیں کیونکہ وجود آنی ہے یعنی ایک آن میں ہوتا ہے، زمانہ میں نہیں ہوتا اگر زمانہ میں ہوگا تو کچھ حصہ ماضی میں اور کچھ حال میں اور کچھ مستقبل میں ہوگا، اور اس طرح وجود تقسیم ہو جائے گا۔ حالانکہ وجود غیر منقسم چیز ہے۔ کیونکہ اگر وجود منقسم ہوگا اور وجود کے لئے اجزا ہوں گے تو یہ اجزا سب کے سب یا موجود ہوں گے یا معدوم ہوں گے یا کچھ موجود ہوں گے اور کچھ معدوم ہوں گے۔ اور یہ تینوں شقیں باطل ہیں۔ اگر سب کے سب موجود ہوں گے تو وجود سے پہلے یہ موجود ہو گئے۔ اور وجود اپنے ہونے سے پہلے ان اجزا کو لاحق ہو گیا، اور یہ محال ہے، اگر معدوم ہوں گے تو اجزائے معدومہ سے کیونکر وجود حاصل ہو سکتا ہے۔ اور کچھ موجود اور کچھ معدوم ہوں گے تو موجود اور معدوم کا مجموعہ وجود ہوگا جو بداہتہً باطل ہے لہٰذا وجود کی ترکیب محال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ شئے جو موجود ہوئی ہے، یا وہ عدم سے وجود میں آئی ہے یا وجود سے وجود میں آئی ہے اگر وجود سے وجود میں آئی ہے تو وہ وجود اس وجود کا عین ہے یا غیر ہے۔ اگر عین ہے تو یہ محال ہے کیونکہ یہ وجود بعینہٖ وہی وجود ہے پھر وجود سے وجود میں آنے کا کیا مطلب ہے، اور اگر وہ وجود اس وجود کا غیر ہے تو گویا وہ وجود اس وجود کا عدم ہے۔ لہٰذا شئے عدم سے ہی وجود میں آئی۔ اور عدم سے وجود کی طرف حرکت دفعتہً ہے۔ لہٰذا وجود بسیط ہے اور دفعی ہے اور آئی ہے۔ اور ہم نے جو یہ کہا کہ عدم سے وجود کی طرف حرکت دفعی ہے، تدریجی نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عدم اور وجود میں واسطہ اور مسافت اور بُعد اور دُوری امتداد نہیں ہے۔ تاکہ اس بُعد اور امتداد کو آہستہ آہستہ تدریجاً طے کرے بلکہ دفعتہً عدم سے وجود میں چیز آجاتی ہے۔ اب یہ وجود آنی آن ثانی میں اسی علت کا محتاج

ہے جس کا آن اوّل میں محتاج تھا کیونکہ اگر علت اوّل سے اس کی احتیاج ختم ہو جائے گی تو علت اوّل کی تاثیر ختم ہو جائے گی تو اثر یعنی یہ وجود ختم ہو جائے گا اور جب یہ وجود ختم ہو جائے گا تو جدید علت پھر اس کو ایجاد کرے گی اور یہ اثر جو اس ایجاد جدید سے بنا ہے پہلے کا غیر ہوگا۔ اور اس صورت میں ہر شئے بمراتب متعدّدہ غیر ہوتی رہے گی۔ اور ایک شئے کا وجود اس کے متعدّد اغیار کا مجموعہ سمجھی جائے گی، اور یہ محال ہے"

ساری تفسیر اس قسم کے نوادرات کا مجموعہ ہے۔

اب آپ کی سمجھ میں آیا کہ ہمارے "علمائے کرام" قرآن کریم کو کس طرح سمجھتے ہیں اور ہزار برس سے ان کی توانائیاں اور وقت، اور اُمت بیچاری کی دولت کن کاموں میں صرف ہو رہی ہے؟

سچ کہا تھا علامہ اقبالؒ نے کہ "دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم قرآن ہے" (جس کی اس قسم کی تفسیریں لکھی جاتی ہیں)۔

پرویز صاحب کی گرانمایہ تصنیف

سلیم کے نام خطوط

مفسر قرآن محترم پرویز صاحب کا مخصوص، دل کش، شگفتہ، اور آسان فہم انداز نگارش

جلد اوّل - آٹھ روپے جلد دوم چھ روپے جلد سوم چھ روپے

ملنے کا پتہ **میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ**

۲۷-بی — شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

رابطۂ باہمی

طلوعِ اسلام کنونشن

اس سال طلوع اسلام کی سالانہ کنونشن، حسبِ سابق بہترین ہاؤس، شالامار ٹاؤن - لاہور - میں، بتاریخ ۷ - ۸ - ۹ / اپریل ۱۹۶۱ء بروز جمعہ، ہفتہ، اتوار منعقد ہوگی۔ نمایندگان کے لئے رہائش و خوراک کا انتظام (بہ ادائیگی اخراجات جس کی بابت آئندہ ماہ اعلان کیا جائے گا) کنونشن کی طرف سے ہوگا۔

(۲) نمایندگان کے علاوہ، مہمانانِ خصوصی، ادارہ کی دعوت پر کنونشن کے عام اجلاس میں شرکت کر سکیں گے۔

(۳) نمایندگان میں سے جو حضرات، کنونشن میں سے کسی موضوع پر تقریر کرنا چاہیں وہ اپنی تقریر کا مسودہ ۱۵ / مارچ تک بھیج دیں۔ اس کے بغیر تقریر کی اجازت نہیں ہوگی۔

(۴) بزمیں اپنے اپنے ریزولیشن، بھی ۱۵ / مارچ تک بھیج دیں۔ اس کے بعد موصول شدہ ریزولیشن کے پیش کئے جانے کا وعدہ نہیں کیا جا سکتا۔

(چوہدری) عبدالرحمن - صدر طلوع اسلام کنونشن کمیٹی

۲۷ - بی - شاہ عالم گیٹ -- لاہور

رپورٹیں

سرگودھا مقامی بزم پورے جوش سے سرگرم عمل ہے۔ یہاں کے احباب دیگر قصبوں میں بھی بزموں کے قیام میں کوشاں ہیں۔ محترم رفیق محمد جمیل خاں نے لیہ سے بزم کے قیام کی اطلاع دی ہے۔

عبدالکریم صاحب بھیرہ میں کام کر رہے ہیں اور محترم عباس خاں صاحب کو ہدایت کی گئی ہے کہ ضلع میانوالی میں بزم کے قیام کے سلسلہ میں حافظ عبدالرشید فہمی (دریاخاں) سے رابطہ قائم کریں۔ گذشتہ اجلاس میں اراکین بزم کے علاوہ دیگر اصحاب نے بھی شرکت فرمائی اور ان کی اکثریت نے باضابطہ رکنیت قبول کرلی۔ دیگر اصحاب کو لٹریچر برائے مطالعہ دیا گیا۔ ماہ رواں میں بزم خواتین کے قیام کی بھی توقع ہے۔

گوجرانوالہ ہر ماہ بزم کے دو اجلاس باقاعدگی کے ساتھ ہو رہے ہیں جن میں شہر کے علاوہ مضافات کے احباب بھی شریک ہوتے ہیں۔ گذشتہ اجلاس میں مختلف اور اہم موضوع روشنی میں لائے گئے۔ اسلامی نظام کے درخشندہ نتائج کو آیات قرآنی سے واضح کیا گیا۔ خدا کی انسان سے اور انسان کی خدا سے محبت کا مفہوم قرآن کی روشنی میں سامنے لایا گیا۔ یہ حقیقت بھی واضح کی گئی کہ حرام و حلال کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ قرآن کا سیاسی نظام اسلامی آئین کے بنیادی اصول، قرآنی معاشرہ اور دیگر پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔ ضلع گجرات کے احباب کے نام 'طلوع اسلام' کے اجراء کا انتظام کیا گیا۔

پشاور صدر گذشتہ ماہ بزم کے چار اجلاس ہوئے۔ دیگر اصحاب کو بھی دعوت شرکت دی گئی اور ان اجتماعات میں محترم پرویز صاحب کی اہم تقاریر سنائی گئیں۔ مجلس عاملہ کی تشکیل سے اراکین بزم کو مطلع کیا گیا۔ مرزا علی احمد خاں اور سیٹھ محمد رفیق صاحب نے حیدرآباد سب کنونشن کی روئیداد کو بوضاحت پیش کیا۔ نئے احباب کی دلچسپی کے پیش نظر انھیں مزید لٹریچر برائے مطالعہ دیا گیا۔ اور ان کے تاثرات سے واضح ہوتا ہے کہ حقائق اپنے اندر کس قدر دلکشی رکھتے ہیں۔

راولپنڈی ماہانہ اجتماعات باقاعدگی سے جاری ہیں۔ راجہ محمد اسلم صاحب کی سرگرم اشاعتی کوششوں نے بہت سے باشعور حضرات کو متاثر کیا ہے اور ان کی یہ قابل تعریف مساعی خوش آئند نتائج پیدا کر رہی ہیں۔ کراچی سے نیا ٹیپ ریکارڈر آنے پر بزم کی جدوجہد مزید موثر ثابت ہوگی۔

نئی بزموں کا قیام

بوریوالہ (ضلع ملتان) نئے سال کا آغاز بزم کی تشکیل کا سامان لے کر آیا۔ یکم جنوری کو تمام احباب نے اپنے اوّلین اجتماع میں باضابطہ طور پر بزم قائم کرلی ہے۔ فارم رکنیت ارسال ہیں۔ محترم

عبدالحئی صاحب (پہ وپرائٹر یونو فرنیچر مارٹ۔ عارف بازار) نمائندہ منتخب ہوئے ہیں۔ محترم سراج منیر صاحب اس ذمہ داری کی بجا آوری میں ان کے دست و بازو ہوں گے۔

لیہ
(ضلع مظفر گڑھ)

یہاں بزمِ طلوعِ اسلام کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ اراکین کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا جائے گا۔ محترم حسن ریاض خاں صاحب نمائندہ بزم منتخب کئے گئے ہیں۔

منظوری کا اعلان

ادارہ، بوریوالہ اور لیہ میں بزموں کے قیام کی باضابطہ توثیق کا اعلان کرتا ہے۔

(ناظمِ ادارہ)

معراجِ انسانیت

از پرویز

* حضور خاتم النبیینؐ کی حیاتِ طیبہ قرآن کریم کے آئینہ میں۔
* سیرتِ مقدسہ پر حسین ترین تصنیف
* سابقہ کتبِ سماوی کی حیرت انگیز کہانی
* ختمِ نبوت کا عظیم فلسفہ۔

بڑا سائز ــــــ ۸۳۲ صفحات ــــ اعلیٰ درجہ کا کاغذ
قیمت ــــــــــــــــ بیس روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ ــــ لاہور